Publisher: Faculty of Arabic & Islamic Studies
Allama Iqbal Open University, Islamabad
Website: https://ojs.aiou.edu.pk/index.php/jmi
Vol.25 Issue: 01 (Junary – June 2026)
Date of Publication: 30- JUNE 2026
HEC Category, **Y**: (2026-2027)

eISSN: 2664-0171,
pISSN: 1992-8556

معارفِ اسلامی

Title	"سیرتِ طیبہ ﷺ سے اشغالِ صوفیہ کی ہمہ گیر تشکیل کا تجزیاتی مطالعہ" An Analytical Study of the Holistic Formation of Sufi Spiritual Practices from the Prophetic Seerah
Authors & Affiliations	**Mufti Waseem Akram Haqqani** M.Phil Scholar Shaheed Benazir University Shringal Dir Bala KPK Email: waseemakramqasmi173@gamil.com ORIC ID: 0009-0005-0941-2460
Dates	***Received :*** 24-04-2026 ***Accepted:*** 24-05-2026 ***Published:*** 30-06-2026
Page	***183-30***
Citation	
Copyright	"سیرتِ طیبہ ﷺ سے اشغالِ صوفیہ کی ہمہ گیر تشکیل کا تجزیاتی مطالعہ" An Analytical Study of the Holistic Formation of Sufi Spiritual Practices from the Prophetic Seerah
Publisher	Faculty of Arabic & Islamic Studies, Allama Iqbal Open University, Islamabad, Pakistan https://aiou.edu.pk/

Indexing & Abstracting Agencies

IRI(AIOU)	HJRS(HEC)	Tehqiqat	Asian Indexing	Research Bib	Atla RDB	SIS
Islamic Research Index	HJRS HEC Journal Recognition System	تحقیقات تحقیقاتی اشاریہ	ASIAN Research Index	Academic Resource Index ResearchBib	ATLA American Theological Library Association Religion Database	SIS

"سیرتِ طیبہ ﷺ سے اشغالِ صوفیہ کی ہمہ گیر تشکیل کا تجزیاتی مطالعہ"

An Analytical Study of the Holistic Formation of Sufi Spiritual Practices from the Prophetic Seerah

Abstract

The Prophetic Seerah (Sīrah al-Nabawiyyah ﷺ) serves as a comprehensive foundation from which all major Islamic disciplines, including jurisprudence (fiqh), theology (kalām), and Sufism (taṣawwuf), derive their intellectual and practical principles. Within the Sufi tradition, the influence of the Seerah is not limited to doctrinal or ethical aspects; rather, it is deeply embedded in practical spiritual disciplines known as *ashghāl*. These Sufi practices—such as remembrance of God (adhkār), meditation (murāqabah), spiritual exercises (mujāhadāt), self-accountability (muḥāsabah), spiritual presence (muḥāḍarah), and spiritual unveiling (mukāshafah)—are inspired by the life, teachings, and conduct of the Prophet Muhammad ﷺ. Their primary objective is the purification of the soul (tazkiyah al-nafs), moral refinement, and the attainment of nearness to Allah. This study explores how Sufi scholars have integrated the Seerah into their spiritual methodologies, shaping a structured system of inner training that benefits both individual character development and social ethics. It also raises a significant contemporary question: in an age marked by spiritual emptiness, moral decline, and materialism, how can Seerah-based Sufi practices contribute to addressing modern human challenges? Thus, this research highlights both the classical integration of the Seerah in Sufi traditions and its continuing relevance in contemporary intellectual and spiritual discourse, offering a renewed understanding of the relationship between Prophetic guidance and Sufi practices.

Keywords: Prophetic Seerah, Sufism, Ashghāl, Murāqabah, Tazkiyah al-Nafs, Islamic spirituality, Prophetic ethics.

تعارف:

رسول اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کے لیے کامل نمونہ اور جامع ہدایت ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا[1]

"بے شک تمہیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے اس کے لیے کہ اللہ اور پچھلے دن کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرے۔"

یعنی انفرادی و اجتماعی، روحانی و اخلاقی اور مادی و تمدنی ہر شعبۂ حیات کے لیے حقیقی رہنمائی صرف اور صرف سیرتِ محمدی ﷺ میں مضمر ہے۔ اسلامی علوم کی مختلف شاخوں فقہ، کلام اور تصوف، نے اپنی فکری اساس اور عملی ڈھانچہ اسی سرچشمہ نبوت سے اخذ کیا ہے۔ خصوصاً تصوف کی روایت میں سیرتِ نبوی ﷺ کا اثر نہایت گہرا اور ہمہ گیر ہے۔ صوفیاء کے اذکار، مراقبات، محاسبہ نفس، مجاہدات اور ریاضتیں وہ روحانی طرق ہیں جن کی بنیاد براہِ راست سیرتِ طیبہ میں ملتی ہے۔ شب بیداری، دوامِ ذکر، تضرع و مناجات، صبر و شکر، عفو و درگزر اور توکل علی اللہ جیسے اوصاف، جو سیرتِ نبوی ﷺ کے نمایاں پہلو ہیں، صوفیاء کے عملی نظامِ تربیت کا مرکزی حصہ بن گئے۔

اس ریسرچ آرٹیکل میں ہم اشغالِ صوفیہ پر بحث کریں گے لیکن اس سے پہلے تصوف کا لغوی و اصطلاحی مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔

سابقہ تحقیقات کا جائزہ:

تصوف اور سیرتِ طیبہ ﷺ کا باہمی تعلق اسلامی علمی روایت میں ایک بنیادی اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ صوفیاء کرام نے اپنے اشغال، اذکار، اور روحانی مناہج کی تشکیل میں سیرتِ نبوی ﷺ کو عملی نمونہ اور بنیادی ماخذ کے طور پر اختیار کیا ہے۔ اس موضوع پر اگرچہ براہِ راست مستقل اور جامع تحقیقات نسبتاً کم ہیں، تاہم مختلف کتبِ سیرت، تصوف اور تذکرہ نگاری میں اس کے اجزاء بکھرے ہوئے انداز میں ملتے ہیں۔ ابتدائی صوفیانہ لٹریچر میں امام قشیری کی "الرسالۃ القشیریہ"، علی ہجویری کی "کشف المحجوب"، اور امام غزالی کی "احیاء علوم الدین" نمایاں ہیں، جن میں سیرتِ نبوی ﷺ کو تصوف کے اصولی و عملی منہج کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ ان کتب میں تزکیۂ نفس، مجاہدہ، ذکر اور اخلاقی تطہیر کے مختلف پہلوؤں کو نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے جوڑ کر پیش کیا گیا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ صوفیاء کے اشغال سیرتِ طیبہ ﷺ سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح بعد کے صوفیانہ ادب میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی "غنیۃ الطالبین"، شاہ ولی اللہ دہلوی کی "حجۃ اللہ البالغہ"، اور مجدد الف ثانی کے مکتوبات میں بھی سیرتِ نبوی ﷺ کو روحانی تربیت اور سلوک کے بنیادی سرچشمہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

2016 میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی اسکالر عابد علی نے "**اشغال صوفیہ اور ان کے مقاصد سیرت رسول ﷺ کی روشنی میں تحقیقی و تنقیدی مطالعہ**" مقالہ لکھا اور رفاہ انٹر نیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کے اسکالر حسنین علی نے "**اشغال صوفیاء میں سیرتِ طیبہ سے استفادہ**" کے عنوان سے آرٹیکل لکھا جو سیرت اور صوفیاء کے تعلق پر جزوی کام ہے، چنانچہ یہ کہا جا سکتا

ہے کہ اگرچہ صوفیاء کے اشغال اور سیرتِ طیبہ ﷺ کے درمیان گہرا تعلق مسلمہ ہے، تاہم اس تعلق کو ایک مستقل تحقیقی موضوع کے طور پر جامع، منظّم انداز میں پیش کرنے کی ضرورت موجود ہے، جسے یہ تحقیق پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

ریسرچ سوالات:

اس تحقیق کا بنیادی سوال یہ ہے کہ سیرتِ طیبہ ﷺ کی روشنی میں اشغالِ صوفیہ کی ہمہ گیر تشکیل کس طرح ممکن ہے؟ نیز اس کے علاوہ ان سوالات کو ہدفِ تحقیق بنایا گیا:

1. اشغالِ صوفیہ کا مفہوم، حدود اور بنیادی اجزاء کیا ہیں؟
2. سیرتِ طیبہ ﷺ میں کون سے اعمال واحوال ایسے ہیں جو اشغالِ صوفیہ کی اساس فراہم کرتے ہیں؟
3. سیرتِ نبوی ﷺ سے اخذ کردہ اشغال کو کن اصولوں کے تحت منظّم اور درجہ بند کیا جا سکتا ہے؟
4. سیرتِ طیبہ ﷺ میں موجود روحانی اعمال کو صوفیاء نے کس طرح باقاعدہ تربیتی نظام میں ڈھالا؟

منہجِ تحقیق:

تصوف کا تعارف:

اسلامی علوم میں تصوف کو ایک نمایاں اور منفرد مقام حاصل ہے جو انسان کی باطنی اصلاح، روحانی بالیدگی اور قربِ الٰہی کے حصول پر مرکوز ہے۔ تصوف کی تعریفات مختلف زاویوں سے کی گئی ہیں، تاہم ان سب کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ تصوف انسان کے ظاہر و باطن دونوں کی تطہیر کر کے اسے اخلاقِ نبوی ﷺ سے آراستہ کرتا ہے۔ تصوف کے ماخذِ اشتقاق میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے، بعض اہلِ علم تصوف کو الصفاء اور الصفو سے مشتق مانتے ہیں جبکہ بعض دیگر اہل علم کے ہاں تصوف "صوف" سے ماخوذ ہے۔اس کے علاوہ الصوف، الصفوۃ، الصفہ اور الصف وغیرہ کے اقوال بھی نقل کئے گئے ہیں۔[2]

فمنهم من قال : (من الصوفة، لأن الصوفي مع الله تعالى كالصوفة المطروحة، لاستسلامه الله تعالى)[3]

"بعض نے کہا کہ یہ "صوفہ" سے ماخوذ ہے، کیونکہ صوفی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسے ہوتا ہے جیسے ایک ڈالا ہوا صوف (اون کا ٹکڑا) جو اللہ تعالیٰ کے سامنے مکمل استسلام (سپردگی) کی علامت ہے۔"

بعض دیگر کے ہاں تصوف "الصفۃ" سے ماخوذ ہے، کیونکہ اس کی حقیقت حسن صفات کو اپنانا اور مذموم اوصاف کو ترک کرنا ہے لیکن ڈاکٹر رفیق العجم تصوف کو صفاء سے مشتق مانتے ہیں اور یہی مؤقف انہوں نے اپنی موسوعہ میں اختیار ذکر کیا ہے کہ :

التصوف مشتق من الصفاء[4]

بعض دیگر صوفیاء حضرات تصوف کو صفہ سے ماخوذ مانتے ہیں اور وجہ ودلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ صوفیاء اصحابِ صفہ کے طریقوں پر عمل کرتے ہیں جبکہ زیادہ مشہور اور متعارف بین الناس قول یہ ہے کہ تصوف اور صوفی کا لفظ صوف بمعنیٰ اون سے لیا گیا ہے کیونکہ صوفیاء اونی لباس پہنتے تھے جس کی وجہ سے ان کو صوفی کہا جاتا ہے۔[5] اس کے علاوہ بھی کئی اقوال نقل کئے گئے ہیں جس سے

معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے ماخذ اشتقاق سے متعلق شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور ہر قول کے قائلین اپنے مؤقف پر دلائل رکھتے ہیں جس کی وجہ سے قطعی طور پر کسی ایک ماخذ اشتقاق کی تعین مشکل ہے۔

اصطلاحی تعریف:

جس طرح تصوف کے اصل اور اشتقاق میں اختلاف ہے، بعینہٖ تصوف کی اصطلاحی مفہوم میں بھی اختلاف ہے اور پچاس سے زائد تعریفیں نقل کی گئی ہیں۔معروف مستشرق نکلسن سے متعلق نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے 78 تعریفات نقل کیں۔صرف یہی نہیں بلکہ بعض نے سوتک تعریفات بھی نقل کی ہیں جبکہ بعض دیگر مشائخ و صوفیاء کے حوالے سے ہزار دوہزار تک منقول ہیں[6] جس سے آپ تصوف کی اصطلاحی تعریف میں اختلاف کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

امام غزالیؒ سے تصوف کے متعلق نقل کیا گیا ہے کہ تصوف دو چیزوں کا نام ہے۔

- ❖ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچ بولنا
- ❖ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور اچھائی کا معاملہ کرنا[7]

یعنی ان کے ہاں جو شخص صدق مع اللہ اور لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی راہ پر گامزن ہو، وہ صوفی ہے اور یہی تصوف کہلاتا ہے۔

المعجم الوسیط میں تصوف کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ:

التصوف طريقة سلوكية قوامها التقشف والتجلي بالفضائل لتزكوا النفس وتسموا الروح[8]

"تصوف وہ سلوکی طریق ہے جس میں بندہ فضائل سے مزین ہوتا ہے، نفس رذائل سے پاک ہوتا ہے اور روح بلند ہوتی ہے۔"

تصوف کی منقول تعریفات میں صرف لفظی وظاہری اختلاف نہیں بلکہ معنوی اور ماہیت کے اعتبار سے بھی اختلاف موجود ہے جس کی وجہ سے ان تعریفات میں تطبیق ممکن نہیں۔علامہ قشیریؒ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے تصوف سے متعلق استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ تصوف ایک ایسی گرہ ہے جو آج تک کسی سے کھل نہ سکی اور ایسا معمہ ہے جو آج تک کسی سے حل نہ ہو سکا۔[9] جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تصوف ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے جس کو ہر صاحبِ علم نے اپنی ایک الگ نظر سے دیکھا جو دوسرے فرد کی نظر اور علم سے یکسر مختلف ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ اور تصوف کا فکری و عملی رشتہ:

اسلامی علوم میں سیرتِ نبوی ﷺ کی حیثیت ایک ایسے سرچشمۂ ہدایت کی ہے جس نے فقہ میں قانون سازی کے اصول فراہم کیے، کلام میں عقائد کی وضاحت کی اور تصوف کو روحانی و اخلاقی تربیت کا عملی سانچہ عطا کیا۔اگر ہم تصوف کے تاریخی ارتقاء کو دیکھیں تو ہمیں واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تصوف منظّم علمی و روحانی ڈسپلن ہے جس نے اپنی اساس براہِ راست قرآن کریم اور سیرتِ نبوی ﷺ سے اخذ کی۔کیونکہ تصوف کے بنیادی مضامین جیسے محبت الٰہی، ذکر و فکر، تقویٰ، صبر و توکل وغیرہ قرآن کریم اور احادیثِ رسول ﷺ کی براہ راست تعلیمات ہیں جن کا عملی مظہر رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ابتدائی صوفیاء کی زندگیوں میں ہمیں واضح طور پر یہ حقیقت نظر آتی ہے کہ ان کی باطنی مشقوں کا مرکز و محور سنتِ نبوی ﷺ تھا۔حضرت حسن بصریؒ، حضرت رابعہ بصریہؒ اور دیگر اوائل صوفیاء کے اقوال و احوال اس بات پر شاہد ہیں کہ انہوں نے عبادات،

ریاضات اور اخلاقی اصلاح میں نبی کریم ﷺ کے اسوہ کو معیار بنایا۔ مثلاً ابو طالب المکی (م 996ء) کی کتاب قُوت القلوب تصوف کے ابتدائی ماخذ میں شمار ہوتی ہے جہاں ذکر، توکل، محبتِ الٰہی اور خوف و رجاء کے مضامین کو براہِ راست سیرت و احادیث سے ماخوذ کیا گیا ہے۔ صوفیاء کے عملی اشغال جیسے ذکر، مراقبہ، خلوت، محاسبہ اور مجاہدہ دراصل وہی طریقے ہیں جن کی جڑیں نبی کریم ﷺ کی عملی زندگی میں پیوست ہیں۔

اشغالِ صوفیاء: تعارف

اشغال، شغل کی جمع ہے جس کا لغوی معنیٰ مشغول شدن ہے۔ شغلا و شغلا و اشغله بکذا سے ہے یعنی مشغول کرنا، غافل ہونا۔[10] قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

اِنَّ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ الۡيَوۡمَ فِىۡ شُغُلٍ فٰكِهُوۡنَ[11]

"بیشک جنت والے آج دل بہلانے والے کاموں میں لطف اندوز (ہو رہے) ہوں گے۔"

اس آیتِ کریمہ کے تحت حضرت مفتی محمد شفیعؒ معارف القرآن میں رقم طراز ہیں کہ یہاں اہلِ جنت کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ وہ مختلف نعمتوں اور مسرت بخش مشاغل میں منہمک ہوں گے۔ فی شغل (کسی مشغولیت میں) کے الفاظ غالباً اس وہم کے ازالے کے لیے لائے گئے ہیں کہ جنت میں نہ عبادات کی تکالیف ہوں گی، نہ فرائض و واجبات، اور نہ ہی معاش کے حصول کی کوئی جدوجہد—تو کہیں یہ فراغت انسان کے لیے باعثِ اُکتاہٹ نہ بن جائے۔ اس اشکال کے جواب میں واضح کیا گیا کہ اہلِ جنت اپنی خوشگوار مصروفیات ہی میں اس قدر مگن ہوں گے کہ کسی قسم کی بے چینی یا گھبراہٹ کا تصور ہی پیدا نہیں ہوگا۔[12]

اشغالِ صوفیاء اور سیرتِ طیبہ ﷺ:

تصوف کے مباحث میں سب سے زیادہ مرکزی اور بنیادی حیثیت نفس کو حاصل ہے۔ قرآنِ کریم نے جہاں ایمان، تقویٰ اور ذکرِ الٰہی کو فلاح کی کنجی قرار دیا، وہاں نفس کے مختلف پہلوؤں کو بھی کھول کر بیان کیا ہے۔ کبھی نفس کو **"امّارہ بالسوء"** کہا[13] جو برائی پر ابھارتا ہے، کبھی **"لوّامہ"** کہا[14] جو گناہ پر ملامت کرتا ہے، اور کبھی **"مطمئنہ"** کہا[15] جو رب کی یاد اور رضا میں سکون پاتا ہے۔ گویا انسانی شخصیت کی اصل کشمکش نفس اور روح کے درمیان ہے۔ صوفیاء کرام نے اسی قرآنی تصور کو اپنی روحانی تربیت کا نقطہ آغاز بنایا۔ ان کے نزدیک سالک کی اصل جدوجہد نفس کی اصلاح اور تزکیہ ہے، کیونکہ نفس ہی تمام رذائل کی جڑ اور تمام فضائل کا رکاوٹ ہے۔ اگر نفس قابو میں آجائے تو دل پر انوارِ الٰہی کی تجلیات اترتی ہیں، اور اگر وہ آزاد چھوڑ دیا جائے تو سالک خواہشات کا اسیر بن کر روحانی زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے صوفیانہ روایت میں جتنے بھی اشغال اختیار کیے گئے، ان سب کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ نفس کی سرکشی کو توڑا جائے، اسے ضبط میں لایا جائے، اور اس کے ذریعے انسان کو اخلاقِ نبوی ﷺ سے مزین کیا جائے۔ ان تمام اشغال کا اصل و ماخذ سیرتِ رسول ﷺ ہے جس کو یہاں بیان کیا جائے گا۔ لیکن ہم آسانی کے لئے صوفیاء کے درج ذیل اشغال کو یہاں موضوعِ بحث بنائیں گے۔

(1) مجاہدہ **(2) محاسبہ** **(3) مشارطہ** **(4) مراقبہ** **(5) مقابلہ**

(6) مکاشفہ

(7) مشاہدہ **(8) محاضرہ**

(1): مجاہدہ: سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں:

مجاہدہ، جہاد و جہد کوشش کرنے کو کہتے ہیں جیسا کہ امام راغب اصفہانیؒ نے "مفردات القرآن" میں لکھا ہے کہ:

"الجهاد و المجاهده استفراغ الوسع في مدافعه العدو"[16]

"جہاد اور مجاہدہ دشمن کے مقابلے میں اپنی پوری قوت صرف کرنے کا ہے۔"

ظاہری دشمن، نفس یا شیطان کے مقابلے کو صوفیانہ اصطلاح میں جہاد و مجاہدہ کہا جاتا ہے، جس کی اصل حقیقت خواہشاتِ نفس کی مخالفت ہے۔ سلوک و طریقت میں یہی بنیادی مقصد ہوتا ہے کہ انسان کا نفس مکمل طور پر روح کے تابع ہو جائے اور اس کی روحانی زندگی میں بلندی پیدا ہو۔ اس عمل کے ذریعے نفس کو رذائل اور اخلاقِ رذیلہ سے پاک کیا جاتا ہے، تاکہ وہ روح کے لیے عالمِ بالا سے اتصال کا ذریعہ بن سکے۔

نفس اور روح کی حقیقت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانی نفس فطری طور پر خواہشات اور مادی لذتوں کی طرف مائل ہوتا ہے، اسی لیے وہ انسان کو ہر وقت دنیاوی رغبات اور مادی وابستگیوں میں الجھائے رکھنا چاہتا ہے۔ نتیجتاً انسان اکثر اوقات اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں انہی خواہشات کی تکمیل میں صرف کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس انسانی روح چونکہ عالمِ بالا سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے اس کا اصل میلان بھی اسی روحانی عالم کی طرف ہوتا ہے اور وہ اسی سے قرب و اتصال کی خواہش رکھتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہمیشہ ایک داخلی کشمکش اور تضاد کی کیفیت قائم رہتی ہے۔ جب روح غالب آتی ہے تو انسان میں نیکی اور اطاعت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، اور جب نفس غالب آ جائے تو اس کے مزاج میں سرکشی اور گناہ کی طرف میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی داخلی تصادم کو قابو میں رکھنے اور روح کو غلبہ دلانے کے لیے صوفیاء کرام مجاہدات اور ریاضتوں کا اہتمام کرتے ہیں۔

مجاہدہ کا طریقہ کار یہ ہے کہ نفس سے حساب لیا جائے اور گناہ کے ارتکاب کی صورت میں اس کو سزا دے۔ لیکن مجاہدے میں نفس پر غیر ضروری بوجھ ڈالنا ضروری نہیں، جیسا کہ بعض صوفیاء کرتے ہیں۔ مجاہدہ کے حوالے سے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ[17]

"اور جو اللہ کی راہ میں کوشش کرے تو اپنے ہی بھلے کو کوشش کرتا ہے بے شک اللہ بے پرواہ ہے سارے جہان سے۔"

صوفیاء کرام کے کلام سے مجاہدات کے درج ذیل طریقے معلوم ہوتے ہیں:

(1) کم کھانا (قلّتِ طعام) (2) کم سونا (قلّتِ منام)
(3) کم بولنا (قلّتِ کلام) (4) کم میل جول رکھنا (قلّت خلط مع الانام)[18]

مجاہدہ کے ان طرق کا ثبوت براہِ راست قرآن کریم و سیرتِ طیبہ ﷺ سے ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے انتہائی فقر و فاقہ کی زندگی گزاری۔ حضرت قتادۃ رسول اللہ ﷺ کے خادم حضرت انس بن مالک کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی نرم روٹی نہیں دیکھی اور نہ آپ ﷺ نے اپنی آنکھوں سے بھنی ہوئی بکری دیکھی۔[19]

یہی حال رسول اللہ ﷺ کے اہل و عیال کا بھی تھا۔ حضرت امی عائشہ روایت نقل فرماتی ہیں کہ:

إن كنا آل محمد صلى الله عليه وسلم لنمكث شهرا ما نستوقد بنار، إن هو إلا التمر والماء[20]

"ہم آل محمد ﷺ ایک ماہ تک اس حالت میں رہتے تھے کہ آگ نہیں جلاتے تھے، بس کھجور اور پانی پر گزر ہوتی تھی۔ "

عہدِ رسالت ﷺ خصوصاً ابتدائی دورِ اسلام میں صحابہ کرامؓ کی عمومی معاشی کیفیت سادہ اور تنگ دستی پر مبنی تھی، اور اکثر اوقات ضروریاتِ زندگی کی فراہمی محدود ہوتی تھی۔ تاہم اس کیفیت کو کسی فنی یا معاشی کمزوری کا نتیجہ قرار دینا درست نہیں، کیونکہ بعثتِ نبوی ﷺ سے قبل خود رسول اللہ ﷺ کی تجارتی سرگرمیاں انتہائی کامیاب تھیں، اور متعدد صحابہ کرامؓ بھی معاشی اعتبار سے خوشحال اور صاحبِ وسعت تھے۔

اسلام کے آغاز کے بعد ایک نمایاں تبدیلی یہ آئی کہ اہلِ ایمان نے مادی وسائل کو مقصدِ حیات بنانے کے بجائے روحانی تربیت اور اخروی کامیابی کو مرکزی حیثیت دی۔ اس دور میں دنیاوی اسباب سے مکمل اعراض تو نہیں تھا، لیکن ان کی ترجیحات میں روحانی ارتقاء، تزکیۂ نفس اور رضائے الٰہی کا حصول غالب رہا۔ اسی لیے انہوں نے ہر اس رکاوٹ کو کم کرنے کی کوشش کی جو ان کی روحانی ترقی اور قربِ الٰہی میں حائل ہو سکتی تھی۔ صحابہ کرامؓ کی اس عملی تربیت کا ایک روشن نمونہ اصحابِ صفہ کی جماعت ہے، جنہوں نے تعلیمِ دین اور صحبتِ نبوی ﷺ کے حصول کے لیے اپنی دنیاوی آسائشوں کو ترک کر دیا اور نفس کی خواہشات پر صبر و قناعت کو ترجیح دی۔ ان کی یہ طرزِ زندگی اس بات کی واضح مثال ہے کہ ابتدائی اسلامی معاشرے میں روحانی اقدار کو مادی ضروریات پر فوقیت حاصل تھی۔ بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ کی روایت نقل کی گئی ہے جس میں حضرت ابوہریرہ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ :

الله الذي لا إله إلا هو، إن كنت لاعتمد بكبدي على الارض من الجوع، وإن كنت لاشد الحجر على بطني من الجوع[21]

"اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں (زمانہ نبوی میں) بھوک کے مارے زمین پر اپنے پیٹ کے بل لیٹ جاتا تھا اور کبھی میں بھوک کے مارے اپنے پیٹ پر پتھر باندھا کرتا تھا۔"

اصحابِ صفہ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ حتی الامکان اپنے نفس کو مادی وابستگیوں اور دنیاوی آلائشوں سے دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی عمومی توجہ روحانی تربیت، تزکیۂ نفس اور منازلِ سلوک کی طرف مرکوز رہتی تھی، اور وہ ان اسباب سے بچنے کی کوشش کرتے تھے جو ان کی روحانی ترقی میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ نفسانی خواہشات کی بے جا پیروی سے اجتناب کرتے اور اپنی زندگی کو سادگی، قناعت اور اخلاص کے اصولوں پر استوار رکھتے تھے۔ مرغوب و لذیذ کھانوں اور دیگر دنیوی آسائشوں کی خواہش دراصل نفس کی فطری طلب ہوتی ہے، اور اس کی مسلسل تسکین بعض اوقات انسان میں غفلت اور روحانی کمزوری پیدا کر سکتی ہے۔ اسی پس منظر میں ابتدائی اسلامی معاشرے میں یہ رجحان نمایاں تھا کہ اہلِ ایمان اپنی خواہشات کو قابو میں رکھ کر نفس کی اصلاح اور اس کے تزکیے کی طرف متوجہ رہیں۔

یہی روحانی مزاج بعد کے ادوار میں صوفیاء کرام کے ہاں ایک منظّم تربیتی نظام کی شکل میں سامنے آیا، جنہوں نے سیرتِ طیبہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے اس عملی اسلوب کو اپنے سلوکی نظام کی بنیاد بنایا۔ انہوں نے مجاہدۂ نفس کو روحانی ترقی کا اہم ذریعہ قرار دیا اور مختلف مواقع پر اپنی ذاتی خواہشات کو ترک کر کے نفس کی تربیت کو ترجیح دی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انسان اپنے اندر موجود نفس کی سرکشی پر قابو پا کر اسے روح کے تابع بنا سکے اور قربِ الٰہی کی راہوں کو ہموار کر سکے۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ نیند انسان کی بنیادی جسمانی ضروریات میں شامل ہے، کیونکہ اس کے بغیر جسمانی اور ذہنی صحت برقرار نہیں رہ سکتی۔ تاہم جب نیند حدِ اعتدال سے بڑھ جائے اور انسان کو سستی، کاہلی اور بے عملی کی طرف لے جائے تو یہ کیفیت نفس کی خواہشات میں شمار ہوتی ہے، کیونکہ نفس انسان کو آرام طلبی اور غیر ضروری راحت پسندی کی طرف مائل کرتا ہے۔ اسلام نے اسی بنا پر دیگر جسمانی ضروریات کی طرح نیند کے معاملے میں بھی اعتدال کا اصول مقرر فرمایا ہے، تاکہ نہ تو انسان اس قدر زیادہ سوئے کہ اس کی ہمت، فعالیت اور دینی و دنیوی ذمہ داریاں متاثر ہوں، اور نہ اتنی کم نیند لے کہ جسمانی صحت اور قوتِ عمل کمزور پڑ جائے۔ شریعت کا عمومی مزاج ہر معاملے میں توازن اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی اس حقیقت کی طرف مختلف انداز سے اشارہ ملتا ہے کہ انسانی زندگی کا نظام ایک متوازن انداز میں قائم کیا گیا ہے، جس میں رات کو آرام اور دن کو محنت و عمل کے لیے بنایا گیا ہے۔

قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا[22]

"رات کے تھوڑے سے حصے کے سوا قیام کرو۔"

یعنی رسول اللہ ﷺ کو قیام الیل کا حکم دیا جارہا ہے لیکن ساتھ ہی جسم کی بنیادی ضرورت نیند کا خیال رکھا گیا ہے کہ پوری رات قیام نہیں کرنا بلکہ کچھ حصہ آرام کے لئے مختص کرنا ہے کہ یہ قیام کسی جسمانی بیماری کا باعث نہ بنے۔ صوفیاء کرام نے نفس کی اس خواہش کو دبانے کے لئے مجاہدہ نوم کا طریقہ اختیار کیا کہ وہ اپنی ایک خاص ترتیب سے نوم یعنی نیند کو ترک کرتے تھے۔ کئی کئی روز نیند ترک کر دیتے اور یہی ابدال کی صفت ہے جس کو امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں نقل کیا ہے کہ ابدال کی نیند صرف غلبہ کی صورت میں ہوتی ہے۔[23] مجاہدہ نوم صوفیاء کی کوئی ذاتی اختراع نہیں بلکہ اس کی اصل بنیاد بھی سیرتِ طیبہ ﷺ میں جابجا ملتی ہے جیسا کہ حضرت مغیرہ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں رات بھر کھڑے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے دونوں پاؤں سوج گئے۔ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپ ﷺ کی اگلی پچھلی تمام خطائیں معاف کر دی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟[24] رسول اللہ ﷺ کا مستقل معمول رات کو جاگ کر نماز پڑھنے کا تھا۔ کبھی کبھار آپ ﷺ اتنی لمبی نماز پڑھتے کہ اگر کوئی اور شریک ہوتا تو اس پر انتہائی شاق گزرتا۔ جیسا کہ حضرت وائل بن حجر نے حضرت عبداللہ ابن مسعود کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک رات میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، آپ ﷺ برابر کھڑے رہے یہاں تک کہ میں نے ایک برے کام کا ارادہ کر لیا، (راوی ابووائل کہتے ہیں:) میں نے پوچھا: وہ کیا؟ کہا: میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ میں بیٹھ جاؤں، اور آپ ﷺ کو (کھڑا) چھوڑ دوں۔[25]

نیز کم بولنا ھی اسی مجاہدہ کا حصہ ہے، انسان کے اعمال و افعال کی طرح اقوال بھی نامہ اعمال میں لکھے جاتے ہیں جس پر مؤاخذہ کیا جائے گا اور اس پر اخروی سزا و جزا کا ترتب ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بولنے سے متعلق واضح ارشادات موجود ہے کہ انسان کو حق سچ بولنا چاہیے اور فضول و لایعنی گفتگو سے پرہیز کرنا چاہیے۔ صوفیاء کرام نے اپنے عملی نظام میں کم گوئی کو بطورِ اصل قبول کیا جیسا کہ امام قشیریؒ نے رسالہ قشریہ میں نقل کیا کہ ضرورت کے بغیر کلام نہیں کرنا چاہیے۔[26] فضول و لایعنی گفتگو یا فحش گوئی سے اجتناب و پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ اس سے انسانی وقار بری طرح مجروح ہوتا ہے۔ صوفیاء کرام نے کم گوئی کا یہ مسئلہ بھی سیرتِ

طیبہ ﷺ سے اخذ کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں واضح طور پر کم بولنے اور بر محل بولنے کا تذکرہ اور ترغیب ملتی ہے جیسا کہ سہل بن سعد نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

من يضمن لي ما بين لحييه، وما بين رجليه اضمن له الجنة[27]

"میرے لیے جو شخص دونوں جبڑوں کے درمیان کی چیز (زبان) اور دونوں ٹانگوں کے درمیان کی چیز (شرمگاہ) کی ذمہ داری دیدے میں اس کے لیے جنت کی ذمہ داری دیتا ہوں۔"

دوسری روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ اچھی بات کہے ورنہ خاموش رہے۔[28]

انسان چونکہ مدنی الطبع حیوان ہے اور کوئی بھی مکمل طور پر خود کفیل نہیں ہو سکتا جو کسی سطح پر بھی دوسرے پر انحصار نہ کرتا ہو۔ لیکن لوگوں سے زیادہ میل جول رکھنا انسان کی روحانی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ نے ابدال کے مطلوبہ خصلتوں میں کم اختلاط بھی ذکر کیا ہے۔[29] اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنے لوگوں سے تعلقات ہوں گے، اتنے ہی مصروفیات میں اضافہ ہوگا جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پھر ہر فرد کی خوشی غمی میں شرکت کرنی پڑتی ہے اور اپنے تمام دوست احباب کو وقت دینا پڑتا ہے جس کی وجہ سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا وقت نہیں ملتا اور مکمل یکسوئی تو کبھی میسر نہیں آتی۔

اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے صوفیاء کرام نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی پر غور کیا اور ان کی نظر قبل از نبوت رسول اللہ ﷺ کی خلوت نشینی پر پڑی کہ آپ ﷺ عبادت کے لئے غارِ حراء تشریف لے جاتے تھے جہاں انتہائی یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ حضرت عائشہ نقل فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر وحی کا ابتدائی دور اچھے سچے پاکیزہ خوابوں سے شروع ہوا۔ آپ ﷺ خواب میں جو کچھ دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح صحیح اور سچا ثابت ہوتا۔ پھر من جانب قدرت آپ ﷺ تنہائی پسند ہو گئے اور آپ ﷺ نے غار حرا میں خلوت نشینی اختیار فرمائی اور کئی کئی دن اور رات وہاں مسلسل عبادت اور یاد الٰہی و ذکر و فکر میں مشغول رہتے۔ جب تک گھر آنے کو دل نہ چاہتا توشہ ہمراہ لیے ہوئے وہاں رہتے۔[30] یعنی آپ ﷺ تحنث فرماتے تھے جو عیسائیت کی رہبانیت سے یکسر مختلف چیز ہے۔ اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے صوفیاء نے زیادہ اختلاط سے منع فرمایا۔

واضح رہے کہ بعض صوفیاء ان مجاہدات کے ضمن میں صحبت و اطاعتِ شیخ کو بھی ذکر کرتے ہیں کہ یہ بھی ایک مجاہدہ ہے جس میں مرید ہر قسم کے حالات میں اپنے شیخ کی صحبت و اطاعت کو لازم پکڑتا ہے کیونکہ بدونِ صحبت اور بغیر اطاعتِ شیخ کے مرید کی کامل اصلاح نہیں ہوتی۔ اس کی طرف سیرتِ طیبہ ﷺ میں واضح طور پر اشارہ ملتا ہے کہ:

الشيخ في اهله كالنبي في امته[31]

"شیخ اپنی قوم میں ایسے ہوتا ہے جیسے نبی اپنی امت میں۔"

یعنی جس طرح نبی کریم ﷺ کی اطاعت لازم تھی، اسی طرح جائز امور میں پیر کی اطاعت بھی لازم ہے کیونکہ بیعت کا مقصد ہی یہی ہے۔ نیز صحابہ کرام کی روحانی ترقی میں ادب و اطاعت کے ساتھ صحبت کا بھی مرکزی کردار تھا اور یہی ان کی فضیلت کی بنیادی وجہ ہے کہ آج کا مسلمان ایک صحابی سے عمل کے مقدار میں بہت آگے بڑھ سکتا ہے لیکن عمل کی کیفیت میں صحابی کے ایک

سجدے تک نہیں پہنچ سکتا، یہی اس صحبت کا اثر ہے۔ سو، صوفیاء نے ان پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے صحبت و اطاعتِ شیخ کو لازم قرار دیا جس کی فکری بنیاد ان کو سیرتِ طیبہ ﷺ سے ملتی ہے۔

(2): محاسبہ: سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں:

صوفیاء کا دوسرا اہم شغل محاسبہ ہے جو دراصل احتساب کا دوسرا نام ہے جس میں انسان اپنے نفس کا احتساب کرتا ہے اور نیکیوں اور گناہوں کا موازنہ کرتا ہے۔ صوفیاء کے ہاں محاسبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب و مبغوض اشیاء کے مابین فرق و تمیز کرنا ہے جو ماضی اور مستقبل دونوں سے متعلق ہو سکتا ہے۔[32] محاسبہ میں انسان کو اپنے نفس کا اس طرح سختی سے حساب کرنا ہوتا ہے جس طرح غیر لوگ اس کا احتساب کرتے ہیں۔ یعنی ہم جب کوئی ناگوار کام کر گزرتے ہیں تو غیر لوگ ہمارا انتہائی سختی سے احتساب کرتے ہیں اور ہمارا کوئی عذر یا بہانہ بھی تسلیم نہیں کرتے بلکہ فوری طور پر حکم ہی لگاتے ہیں۔ یہی معاملہ اپنے نفس کے ساتھ کرنا ہی محاسبہ ہے کہ اگر نفس کسی جرم پر آمادہ کرے تو انسان کو اپنے نفس کو سخت سرزنش کرنی ہوتی ہے اور اس حوالے سے نفس کا کوئی عذر یا بہانہ تسلیم نہیں کرنا چاہیے، تب جا کر نفس آئندہ فعل کے ارتکاب سے قبل اس سزا اور سرزنش کو یاد کرتا ہے اور انسان گناہوں سے بچنے کی کوشش میں کامیاب ہوتا ہے۔

محاسبہ صوفیاء نے اپنے فکری و عملی نظام کا حصہ بنایا کیونکہ یہی محاسبہ آگے جا کر مراقبہ بنتا ہے جس پر آگے ہم کلام کریں گے۔ اس طرح صوفیاء کا ماننا ہے کہ جو شخص جو دنیا میں محاسبہ کا عادی ہو اور ہر فعل پر اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہو تو قیامت کے دن اس کے لئے حساب و کتاب آسان ہوگا جس پر رسول اللہ ﷺ کی حدیث بھی دال ہے کہ:

إن المؤمن قوام على نفسه يحاسب نفسه لله ، وإنما خف الحساب يوم القيامة على قوم حاسبوا أنفسهم في الدنيا ، وإنما شق الحساب يوم القيامة على قوم أخذوا هذا الأمر على غير محاسبة[33]

"بیشک مؤمن اپنے نفس پر نگہبان ہوتا ہے، وہ اللہ کے لیے اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہتا ہے۔ قیامت کے دن جن لوگوں کا حساب ہلکا ہوگا وہ وہی ہوں گے جنہوں نے دنیا میں اپنے نفس کا حساب کر لیا تھا۔ اور جن لوگوں نے اس معاملے کو بغیر محاسبے کے لے رکھا تھا، ان پر قیامت کے دن حساب سخت ہوگا۔"

محاسبہ کا ایک اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان کو حتیٰ الوسع گناہوں سے اجتناب اور نیکی پر مداومت و استقامت کا موقع ہاتھ آتا ہے اور نفس محاسبہ کے خوف سے گناہوں پر نہیں آمادہ نہیں کرتا۔ جیسا کہ اشرف علی تھانویؒ کے حوالے سے نقل کیا کہ محاسبہ کا خوف نفس کو شرارت کرنے سے باز رکھتا ہے۔[34] نیز محاسبہ سے روزِ آخرت کے حساب و کتاب کا استحضار بھی ہوتا ہے کہ انسان جب رات کو سونے سے قبل نفس کا محاسبہ کرتا ہے تو اس کو قیامت کے دن حساب و کتاب کا منظر یاد ہوگا اور خشیتِ الٰہی میں کمال کا درجہ حاصل ہوگا۔

خود احتسابی، اچھا دوست و خلیل، کامل شیخ کی صحبت و اطاعت، مطالعہ خلقت اور معاتبہ و معاقبہ محاسبہ کے وہ طرق ہیں جن کو صوفیاء انتہائی سختی سے اختیار کرتے ہیں۔ محاسبہ کے اخذ و اختیار میں بھی صوفیاء نے سیرتِ طیبہ ﷺ کو بطورِ ماخذ و اساس قبول کیا۔ ہم سیرتَ طیبہ ﷺ پر غور کرتے ہیں تو محاسبہ کے کئی پہلو ہمیں سیرت میں روزِ روشن کی طرح نظر آتے ہیں جیسا کہ محاسبہ میں ہر عمل کا اخلاص مطلوب ہوتا ہے کہ انسان کوئی بھی عمل کرے، خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرے کیونکہ جو ابد ہی کا اختیار اللہ تعالیٰ

کو حاصل ہے۔ اسی پہلو پر رسول اللہ ﷺ نے خصوصی توجہ دی اور اعمال کی بنیاد اور دار و مدار ہی نیت کو قرار دیا۔[35] رسول اللہ ﷺ محاسبہِ نفس سے متعلق سے ارشاد فرماتے ہیں کہ :

إذا أراد الله بعبد خيرا جعل له واعظا من نفسه يأمره و ينهاه[36]

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ بھلائی و خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے نفس سے واعظ مقرر کرتا ہے تو اس کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔"

دوسری روایت میں آیا ہے کہ عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے، اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے، اور عاجز وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشوں پر لگا دے، پھر اللہ تعالیٰ سے تمنائیں کرے۔[37] اس طرح دیگر احادیث اس امر پر واضح دال ہیں کہ انسان کو اپنی روحانی زندگی کی بہتری کے لئے اور گناہوں سے بچنے کے لئے مسلسل اپنے نفس کا احتساب کرنا چاہیے تاکہ نفس کو برابر محاسبہ کا خوف لاحق رہے۔ صوفیاء چونکہ روحانی ترقی میں نفس کی نگہداشت کو لازمی سمجھتے ہیں تو انہوں نے سیرتِ طیبہ ﷺ سے محاسبہ کے اصول اخذ کئے اور تصوف کے روحانی نظام میں اہم اصول و شغل کے طور پر لیا۔ آج کے دور میں بھی روحانی ترقی اور نفس کی تہذیب کے سلسلے میں محاسبہ انتہائی کارگر اور مفید نسخہ ہے جس کے دائمی اثرات انسان کی روحانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔

(3): مشارطہ: سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں:

انسانی زندگی میں خیر و شر کی کشمکش ہمیشہ سے جاری ہے۔ نفس اپنی کمزوری اور خواہشات کے زیرِ اثر برائی کی طرف مائل ہوتا ہے، جبکہ عقل اور ایمان انسان کو نیکی اور تقویٰ کی راہوں پر گامزن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کشمکش میں کامیابی کے لیے عملی تدابیر ضروری ہیں۔ انہی تدابیر میں سے ایک "مشارطہ" ہے یعنی اپنے نفس کے ساتھ شرط لگانا۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان دن کے آغاز میں اپنے نفس کے شرط لگاتا ہے کہ میں آج فلاں چیز نہیں کھاؤں گا، فلاں کام کروں گا اور فلاں کام سے اجتناب کروں گا وغیرہ وغیرہ۔ پھر دن کے اختتام پر انسان اپنے نفس کے ساتھ دن بھر کا حساب کتاب کرتا ہے۔ نفس چونکہ مسلسل شرارت پر ابھارتا ہے اور انسان کے حقیقی دشمن کا کردار ادا کر سکتا ہے جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے نفس کو انسان کا دشمن قرار دیتے ہوئے اتباع ھویٰ نفس سے منع فرمایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو نفس کے شرور سے بچنے کی خصوصی دعا سکھائی کہ :

اللهم الهمني رشدي واعذني من شر نفسي[38]

"اے اللہ ! تو مجھے میری بھلائی کی باتیں سکھا دے، اور میرے نفس کے شر سے مجھے بچا لے۔"

دوسری روایت میں ہے کہ :

اللهم آت نفسي تقواها، وزكها انت خير من زكاها، وانت وليها ومولاها[39]

"اے اللہ ! میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا فرما اور اسے پاک کر دے تو اسے سب سے بہتر پاک وصاف کرنے والا ہے تو ہی اس کا کارساز اور مالک ہے۔"

مشارطہ کا مقصد تزکیہ نفس ہے کہ نفس کا پاک کیا جائے اور انسان کی روحانی زندگی کے لئے مضر و نقصان دہ کیفیات سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے صوفیاء نے یہ ترکیب نکالی کہ دن کے آغاز میں سالک و مرید کو اپنے نفس کے ساتھ کڑی

اور مضبوط شرط لگانی چاہیے۔ روزانہ صبح اٹھ کر تھوڑی دیر تنہائی میں بیٹھ کر اپنے نفس کو خوب فہمائش کرے کہ دیکھو فلاں فلاں کام کرنا اور فلاں فلاں کام سے بچنا ہے۔ اس کے بعد پھر دن کے اختتام پر محاسبہ کیا جاتا ہے کہ نفس نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی اور کیوں کھائی؟ صوفیاء کے اس ترکیبِ اصلاح کا اصل ماخذ بھی سیرتِ طیبہ ﷺ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے نفس کی سرکشی اور زور توڑنے کے لئے مختلف طرق تجویز فرمائے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ :

ليس الشديد بالصرعة، إنما الشديد الذي يملك نفسه عند الغضب[40]

پہلوان وہ نہیں ہے جو کشتی لڑنے میں غالب ہو جائے بلکہ اصلی پہلوان تو وہ ہے جو غصہ کی حالت میں اپنے آپ پر قابو پائے بے قابو نہ ہو جائے۔"

یعنی آپ ﷺ نفس کو مغلوب کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں کہ اصل قوت وہ ہے جو نفس کی سرکشی کو توڑ کر راہِ راست پر لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو عقل مند ہونے کی سند دی ہے جو نفس کی شرارتوں کو جان کر اپنی حفاظت کرنا جانتا ہو اور ہر اس شخص کو بے وقوف اور احمق قرار دیا ہے جو نفس کے خواہشات کی پیروی کرتا ہے اور اپنے نفس کو خدا بنا کر نفس کی خواہش پر راہ کی تعین کرتا ہے۔[41] صوفیاء نے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک منظّم تربیتی طریقہ کار مرتب کیا جس میں مشارطہ انتہائی اہم جزء ہے کہ سالک دن کے آغاز میں اپنے نفس کے ساتھ ایک واضح عہد کرے کہ وہ اس دن تمام احکامِ الٰہی کی تعمیل اور معاصی سے اجتناب کرے گا۔ یہ عہد دل و دماغ کی پوری توجہ اور ارادے کے ساتھ کیا جاتا ہے تاکہ انسان اپنی عملی زندگی میں واضح سمت اختیار کر سکے۔

علمی زاویے سے دیکھا جائے تو مشارطہ تزکیۂ نفس کے لیے ایک شعوری اور ارادی منصوبہ بندی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی و تربیتی میکانزم ہے جو انسان کی ارادتی قوت کو مضبوط کرتا ہے۔ جدید نفسیات کی اصطلاح میں یہ **Self-Regulation** اور **Goal-Setting** کا ابتدائی مرحلہ ہے، جس کے بغیر کسی بھی اخلاقی یا روحانی اصلاح کا عمل پائیدار نہیں ہو سکتا۔ صوفیاء نے اسی حقیقت کو سمجھتے ہوئے مشارطہ کو روزمرہ زندگی کا حصہ بنایا اور اسے تربیتِ سالک کی بنیاد قرار دیا۔ مشارطہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کو محض جذبات اور عادات کے بہاؤ کے مطابق نہیں گزارتا بلکہ ہر دن شعوری طور پر اپنے آپ کو ایک واضح مقصد کے تابع کرتا ہے۔ یہی کیفیت اسے مراقبہ کی طرف لے جاتی ہے، جہاں وہ دن بھر اپنے اعمال پر نظر رکھتا ہے، پھر محاسبہ میں اپنے کیے پر غور کرتا ہے اور آخر میں معاتبت کے ذریعے اپنے نفس کو اصلاح پر مجبور کرتا ہے۔

(4): مراقبہ: سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں:

مراقبہ وہ کیفیت ہے جس میں انسان اپنے دل و دماغ کو اس شعور سے معمور کر لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر لمحہ اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہے، اس کے ارادے، خیالات اور اعمال سب اس کے علم میں ہیں۔ جب یہ احساس دل میں راسخ ہو جاتا ہے تو انسان کی پوری زندگی میں ایک عجیب سنجیدگی، پاکیزگی اور ذمہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔ سیرتِ طیبہ ﷺ میں مراقبہ کا عملی مظہر نہایت واضح ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی پوری حیاتِ مبارکہ اسی شعور کا زندہ پیکر تھی کہ ہر عمل صرف اور صرف اللہ کے لیے ہو اور ہر لمحہ اس کی رضا کے مطابق بسر ہو۔ آپ ﷺ کی شب بیداریاں، طویل قیام، گریہ وزاری، امت کے لیے دعائیں اور اپنے نفس پر مسلسل نظر رکھنا ــــ یہ سب مراقبہ کی اعلیٰ ترین صورتیں ہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان کہ "اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم یہ یقین رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ دراصل مراقبہ کا خلاصہ اور اس کی روح ہے۔

یہی کیفیت صحابہ کرامؓ میں بھی راسخ تھی۔ انہوں نے اپنے ظاہر و باطن دونوں کو اس احساس کے تابع کر لیا تھا کہ وہ ہر وقت اللہ کی نگاہ میں ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اعمال میں خلوص، ان کی عبادات میں خشوع اور ان کی زندگی میں تقویٰ غالب نظر آتا ہے۔ مراقبہ کا یہی اثر تھا کہ وہ دنیاوی معاملات میں بھی دیانت اور انصاف کو مقدم رکھتے اور چھوٹے سے چھوٹے گناہ سے بچنے کی کوشش کرتے۔

مراقبہ کا لغویٰ معنٰی "نگہبانی" اور "پاسبانی" ہے۔[42] بعض صوفیاء کرام لفظ مراقبہ کو "رقیب بمعنٰی نگہبان" سے ماخوذ مانتے ہیں[43] جبکہ بعض کے ہاں مراقبہ "رقوبت اور رقابت بمعنٰی حفاظت و انتظار کرنا" سے ماخوذ مانتے ہیں[44] جس کا مطلب آنکھیں بند کر کے مبداء فیاض یعنی ذات باری تعالیٰ کی طرف سے خیر و بھلائی کے نزول کا انتظار کرنا ہے۔ مراقبہ کی تعریف صوفیاء کرام اس طرح کرتے ہیں کہ:

المراقبة لعبد قد علم ويتقن ان الله تعالىٰ مطلع علىٰ ما في قلبه وضميره[45]

"(کسی) بندے کا مراقبہ یہ ہے کہ اس کو (ہر حال میں) یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے دل اور ضمیر سے واقف ہے۔"

پیر ذوالفقار احمد نقشبندی صاحب مراقبہ کی تعریف فرماتے ہیں کہ:

"تصوف کی اصطلاح میں مراقبہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے لو لگا کر بیٹھنے کو۔"[46]

یعنی حواس خمسہ اور مکمل باطنی توجہ و انہماک سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے انوارات و برکات کی طرف متوجہ ہونا ہی مراقبہ ہے جس میں حواس خمسہ و باطنہ[47] کے ساتھ محبوب حقیقی کے انتظار میں بیٹھا جاتا ہے۔ محاسبہ سے مراقبہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان جب اپنے نفس کے ساتھ شرط لگاتا ہے اور دن کے اختتام کے بعد محاسبہ کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں مراقبہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور انسان دوام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ مشغول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے جو انسان کا حقیقی مقصد اور نصب العین ہے۔

سیرتِ طیبہ ﷺ میں مراقبہ کو مختلف انداز میں اجاگر کیا گیا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

ان تعبد الله، كانك تراه، فإنك إن لا تراه، فإنه يراك[48]

"اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

یہی مراقبہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت اس انہماک و توجہ سے کرے کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایات اس پر برس رہی ہیں اور یہ بندہ اپنے دامن میں ان انعامات و عنایات کو سمیٹ رہا ہے۔ اس کا دماغ بالکل اللہ تعالیٰ کی طرف حاضر ہے اور نفس فارغ ہے اور دل یکسر جمع ہے۔ امام نوویؒ نے رسول اللہ ﷺ کے اس کلام پر بحث کی ہے کہ اس کلام کا مقصد اعمال میں اخلاص پیدا کرنا ہے اور بندے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے مراقب ہونے کی ترغیب دی گئی ہے۔[49] ایک دوسری حدیث میں اس کیفیت کو خشیتِ الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ان تخشى الله، كانك تراه، فإنك إن لا تكن تراه، فإنه يراك[50]

یعنی احسان کو احادیث میں خشیت کے ساتھ بھی بیان کیا گیا ہے کہ انسان ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہو کہ دورانِ عبادت یہ یقین ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خود اپنے ابتدائی عمل سے بھی مراقبہ کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آپ ﷺ قبل از بعثت غارِ حراء میں تحنث فرمایا کرتے تھے جو مراقبہ ہی کی صورت بنتی ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف مکمل یکسوئی اور انہماک سے توجہ کرنا احادیث اور سیرتِ طیبہ ﷺ سے ثابت شدہ امر ہے اور صوفیاء کے مروجہ طرق ہائے مراقبہ کا تذکرہ بھی روایات میں جگہ بہ جگہ ملتا ہے۔ آج کل صوفیاء مراقبہ کے لئے کوئی خاص طریقہ ذکر نہیں کرتے لیکن مراقبہ کے اقسام کے پیشِ نظر مختلف طریقے نقل کئے ہیں۔ عموماً دو زانوں یا چار زانوں کیفیت میں بیٹھ کر مراقبہ کیا جاتا ہے کہ ذہن و دل میں غیر اللہ سے مکمل خالی کر کے اس معنیٰ کا تصور کرنا کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر اور ہمیشہ میرے ساتھ ہے۔ امام ترمذیؒ نے شمائل ترمذی میں رسول اللہ ﷺ کے طرزِ جلوس کو بیان کرنے کے لئے مستقلاً باب قائم کیا ہے جس میں مراقبہ کے لئے ایک خاص کیفیت میں بیٹھنے کی روایت نقل کی گئی ہے۔

عن قيلة بنت مخرمة، انها رات رسول الله صلى الله عليه وسلم في المسجد وهو قاعد القرفصاء[51]

"سیدہ قیلہ بنت مخرمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو مسجد میں گوٹ مار کر بیٹھے ہوئے دیکھا۔"

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا جلس في المسجد احتبى بيديه[52]

(ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ) رسول اللہ ﷺ جب مسجد میں بیٹھتے تو گوٹ مار کر تشریف فرما ہوتے۔"

یہی طرزِ جلوس صوفیاءِ کرام نے مراقبہ کے لئے مستعار لیا اور آج کل ہم صوفیاء کو مراقبہ کرتے ہوئے اس خاص کیفیت میں پاتے ہیں۔ مقام مشاہدہ کا حصول، احساسِ قرب، مرتبہ وزارت اور اطمینان قلبی و یکسوئی کا حصول مراقبہ کے اہم مقاصد میں شمار ہوتے ہیں جو کسی بھی سالک کی انتہائی ضرورت اور مقصد ہے جس کے لئے وہ کسی متبع سنت مرشد کا ہاتھ تھامتا ہے۔

(5): مقابلہ: سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں:

مقابلہ کا معنیٰ و مفہوم تو واضح ہے کہ کسی چیز کے خلاف ہونا، برسرِ پیکار ہونا۔ یعنی انسان کا نفس و شیطان کے خلاف برسرِ پیکار ہونا۔ انسانی زندگی ایک مسلسل جدوجہد کا نام ہے جس میں خیر و شر کی کشمکش ہر لمحہ جاری رہتی ہے۔ شریعتِ اسلامیہ نے انسان کو اس جہادِ اکبر کی طرف متوجہ کیا ہے جس میں سب سے بڑا دشمن انسان کا اپنا نفس اور شیطان ہے۔ قرآن کریم نے نفس کو کبھی **"امّارۃ بالسوء"** قرار دیا اور کبھی **"لوّامہ"** کے مقام پر ذکر کیا، جبکہ شیطان کو **"عدوٌ مبین"** قرار دیا۔ گویا انسان کو نہ صرف ظاہری دشمنوں کا سامنا ہے بلکہ اس کے باطن میں بھی ایسے دشمن موجود ہیں جو اسے راہِ ہدایت سے ہٹانے کے لیے ہمہ وقت کوشاں ہیں۔ تصوف اور سلوک کی راہ میں سالک کے لیے سب سے بڑی آزمائش یہی ہے کہ وہ نفس اور شیطان کے ان وساوس اور خواہشات کا مقابلہ کرے جو اسے غفلت، معصیت اور گناہ کی طرف کھینچتے ہیں۔ صوفیاء نے اس مقابلے کو سلوک کی اصل بنیاد قرار دیا ہے کہ جو شخص اپنے نفس اور شیطان کو مغلوب نہ کر سکے وہ اللہ کے قرب کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک عملی جدوجہد ہے جس میں سالک اپنے اعمال، نیتوں اور ارادوں کو قرآن و سنت کے پیمانے پر پرکھتا ہے۔ وہ اپنے باطن میں پیدا ہونے والے ہر خیال اور ہر داعیہ کو دیکھتا ہے کہ یہ خیر کی طرف لے جا رہا ہے یا شر کی طرف۔ اگر یہ داعیہ شریعت کے مطابق ہو تو اسے اختیار کرتا ہے اور اگر یہ داعیہ معصیت یا غفلت کا سبب ہو تو اس کو رد کر دیتا ہے۔ یوں "شیطان اور نفس سے مقابلہ" دراصل تزکیۂ نفس، مراقبہ اور محاسبۂ قلب کا جامع تصور ہے جو

انسان کو روحانی بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے اور اسے اپنے خالق کے قریب کرتا ہے۔ یہی وہ جہاد ہے جسے صوفیاء نے "جہادِ اکبر" کہا اور اس کی تکمیل کو کامیاب زندگی کی علامت قرار دیا۔

امام غزالیؒ مقابلہ کے لئے محاربہ کی اصطلاح بھی استعمال فرماتے ہیں اور نفس و شیطان کے گمراہ کن وسوسوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے باقاعدہ طریقہ بھی بتلاتے ہیں کہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ انسان شیطان کے مقابلے کے لیے دونوں پہلو اختیار کرے: ایک طرف اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے اور اس پر کامل بھروسہ رکھے، اور دوسری طرف اس کے فریب کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ اگر پناہ مانگنے کے باوجود وسوسے باقی رہیں تو یہ آزمائش ہے، جس میں دیکھا جاتا ہے کہ انسان ثابت قدم رہتا ہے یا ہار مان لیتا ہے۔ یہی اصول باطل قوتوں کے بارے میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے مقابلے کا حکم دے کر ہمارے اخلاص اور استقامت کو پرکھتا ہے۔[53]

پھر آگے جا کر امام غزالیؒ مقابلہ کے ضمن میں تین امور کو بیان فرماتے ہیں:

- شیطان کے مکر و فریب اور چالاکی کو پہچاننا
- شیطان کے گمراہ کن دعوت کا انکار
- ذکر الٰہی کی کثرت

اس کے علاوہ مختلف طریقوں سے شیطان اور نفس کا مقابلہ کیا جاتا ہے کہ جس کا ثبوت سیرتِ طیبہ ﷺ میں واضح طور پر ملتا ہے۔ جیسا کہ ذکر الٰہی نفس و شیطان کے ساتھ مقابلہ کا قوی و مؤثر ہتھیار ہے جس سے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ[54]

"بے شک جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں جب انہیں کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں پھر اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔"

یعنی شیطان کے خطرہ کا فوری حل اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر ہے جس کو سن کر شیطان دم دبا کر بھاگتا ہے اور مزید انسان کے مقابلے میں میدان میں نہیں ٹھہر سکتا۔ ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ ابن مسعود کے حوالے سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی پر شیطان کا اثر (وسوسہ) ہوتا ہے اور فرشتے کا بھی اثر (الہام) ہوتا ہے۔ شیطان کا اثر یہ ہے کہ انسان سے برائی کا وعدہ کرتا ہے، اور حق کو جھٹلاتا ہے۔ اور فرشتے کا اثر یہ ہے کہ وہ خیر کا وعدہ کرتا ہے، اور حق کی تصدیق کرتا ہے۔ تو جو شخص یہ پائے، اس پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ اور جو دوسرا اثر پائے یعنی شیطان کا تو شیطان سے اللہ کی پناہ حاصل کرے۔ پھر آپ ﷺ نے آیت "الشيطان يعدكم الفقر ويأمركم بالفحشاء" پڑھی۔"[55]

اس میں رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر شیطان کے اثر پانے کے وقت شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا ذکر ملتا ہے جس کے لئے احادیث میں تعوذ پڑھنے کا ذکر ملتا ہے۔ جیسا کہ روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسن اور حضرت حسین کے لئے تعوذ پڑھتے تھے اور یہ دعا مانگتے تھے کہ:

اعيذكما بكلمات الله التامة من كل شيطان وهامة ومن كل عين لامة[56]

"میں اللہ کے کلمات تامہ کے ذریعے ہر شیطان، زہریلے جانور اور ہر ضرر رساں نظر کے شر سے تمہیں بچاتا ہوں۔"

حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کو بیدار ہوتے اور اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کرتے تو سبحانك اللهم وبحمدك تبارك اسمك وتعالى جدك ولا إله غيرك کہہ کر تین مرتبہ لا إله إلا الله کہتے، پھر یوں کہتے اعوذ بالله السميع العليم من الشيطان الرجيم من همزه ونفخه پھر تین مرتبہ اللہ اکبر کہتے، پھر دوبارہ یوں کہتے اعوذ بالله السميع العليم من الشيطان الرجيم من همزه ونفخه"[57]

صرف یہی نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ سے شیطان اور نفس کے وسوسوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مخصوص دعائیں منقول ہیں اور اس کے ساتھ صدقہ، تسمیہ اور تلاوتِ قرآن کریم کے ذریعے بھی شیطان اور نفس کی سرکشی سے چھٹکارا پانے کے خصوصی طرق ذکر کئے گئے ہیں۔

(6): مکاشفہ: سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں:

مکاشفہ صوفیاء کے اہم اشغال میں سے ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ:

فهو التحقيق الصحيح بمطالعة تجليات الاسماء الالهية[58]

"اسماء باری تعالیٰ کی تجلیات سے حق تک پہنچنا۔"

صاحبِ عوارف المعارف کشف کی حقیقت کو نہایت گہرائی اور وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے مطابق کشف کا مفہوم یہ ہے کہ بعض اوقات سالکِ ذکر و فکر پر حقائق بلا کسی پردۂ تمثیل کے براہِ راست منکشف ہو جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ان واردات کو کشف اور خبرِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کشف کبھی براہِ راست مشاہدے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور کبھی محض سماعت کے ذریعہ۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ذاکر اس خبر کو اپنے باطن کی گہرائیوں میں سنتا ہے، اور کبھی یہ کیفیت یوں طاری ہوتی ہے کہ گویا وہ خبر ہوا کی جنبش سے اس کے کانوں تک پہنچائی جارہی ہو، اور یہ سماعت براہِ راست ہوتی ہے نہ کہ باطنی وساطت سے، بالکل اسی طرح جیسے کسی ہاتفِ غیبی کی آواز کانوں سے ٹکراتی ہے۔

ان تمام کیفیات میں کبھی اطلاع ذاکر کی اپنی ذات کے بارے میں ہوتی ہے اور کبھی کسی دوسرے فرد یا واقعہ کے بارے میں، جسے اللہ تعالیٰ اسے بتانا چاہتا ہو تاکہ اس کے ایمان و یقین میں اضافہ ہو اور وہ معرفتِ حق میں مزید راسخ ہو جائے۔ کشف کی ایک اور صورت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ سالک کو خواب میں کسی حقیقت کا براہِ راست مشاہدہ کرایا جاتا ہے اور وہ شے بعینہٖ اسی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جس میں وہ فی الواقع موجود ہے۔ اس طرح خواب ایک ذریعۂ کشف بن جاتا ہے اور مشاہدۂ حقیقت کی منزل کو اور زیادہ واضح اور یقینی کر دیتا ہے۔[59] یعنی کشف کا مطلب یہ ہے کہ انسان سے بشری تقاضوں کا حجاب زائل ہو تو اس کے لئے عالمِ بالا کے حقائق اس پر منکشف کی جاتی ہے جس کو وہ واضح طور پر دیکھتا ہے۔ یہی انکشافِ حقائق مکاشفہ کہلاتا ہے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ نے مکاشفہ کی انتہائی آسان فہم تعریف کی ہے کہ:

"اسرارِ الٰہی میں کسی حقیقت کے انکشاف کے بارے میں یقینی علم حاصل ہونے کا نام مکاشفہ ہے۔"[60]

یعنی اس میں یقینی علم و تحقیق کا حاصل ہونا ضروری ہے۔ عمومی طور پر کشف سے یہی معنیٰ مراد ہے کہ حال و دل پر کوئی چیز اس قدر غالب ہو کہ بالکل ایسا واضح ہو کہ کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے یعنی کشف کی اصل حقیقت یہ ہے کہ جب انسان اپنے ظاہر سے توجہ ہٹا کر اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کی روح اس کے حیوانی نفس پر غالب آجاتی ہے۔ چونکہ روح اپنی لطافت کے اعتبار سے نورانی اور انکشافِ حقائق کی قدرت رکھنے والی ہے، اس لیے یہ تغلب اسے اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں مخفی حقائق اس پر منکشف ہونے لگتے ہیں۔ اس کیفیت کو ہی کشف کہا جاتا ہے اور اسی حالت میں سالک پر الہامات کا فیضان شروع ہوتا ہے۔ اس طرح کشف دراصل روحانی لطافت کے غلبے اور حیوانی کثافت کے مغلوب ہونے کا نتیجہ ہے، جو انسان کو مشاہدۂ حقیقت کے قریب کر دیتا ہے۔

کشف و مکاشفہ کا ثبوت سیرتِ طیبہ ﷺ سے ملتا ہے جس کی دلیل وحی اور رویائے صالحہ کی ابتدائی اشکال ہیں، جو مکاشفہ کی ہی صورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

لم يبق من النبوة إلا المبشرات، قالوا: وما المبشرات؟قال: الرؤيا الصالحة[61]

" نبوت میں سے صرف اب مبشرات باقی رہ گئی ہیں۔ صحابہ نے پوچھا کہ مبشرات کیا ہیں؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اچھے خواب۔"

ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر وحی کا ابتدائی دور اچھے سچے پاکیزہ خوابوں سے شروع ہوا۔ آپ ﷺ خواب میں جو کچھ دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح صحیح اور سچا ثابت ہوتا۔[62] یہ سچے اور پاکیزہ خواب مکاشہ کی ہی ایک صورت ہے جو وحی کی تمہید کے طور پر آپ ﷺ دیکھتے ہیں اور اگلی صبح اس کا عملی مشاہدہ بھی فرماتے۔ یعنی جو رات کو آپ ﷺ خواب میں دیکھتے، صبح وہ روشنی کی طرح سچا ثابت ہوتا جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ رات کو خواب ہی میں آپ ﷺ پر مختلف احوال منکشف کیے جاتے تھے۔ اسی طرح حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

اتقوا فراسة المؤمن فإنه ينظر بنور الله[63]

" مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

علمائے کرام نے اپنی تصانیف میں فراست کے متعدد مفاہیم بیان کیے ہیں، لیکن اکثر محققین دو بنیادی معانی کو اختیار کرتے ہیں۔

پہلا معنیٰ: یہ وہ فراست ہے جو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے خاص بندوں (اولیاء) کے قلوب پر القاء ہوتی ہے۔[64] اس کو ایک طرح کا روحانی انکشاف کہا جا سکتا ہے جس کے نتیجے میں وہ کسی شخص کے پوشیدہ احوال سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت کراماتِ اولیاء کی ایک قسم میں شمار کی جاتی ہے۔ اس فراست میں ظاہری اسباب اور حسی ذرائع کے بجائے قلبی صفائی اور روحانی تعلق کی بنیاد پر حقائق کا ادراک ہوتا ہے۔ مذکورہ حدیثِ نبوی "مؤمن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"، اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہے۔

دوسرا معنیٰ: یہ وہ فراست ہے جو کسی روحانی انکشاف کے بغیر خالصتاً عقلی استدلال، تجربات، مشاہدات، اور انسانی نفسیات کی باریک بینی سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک صاحبِ علم اور صاحبِ بصیرت شخص اپنے تجربات، عادات اور اخلاقیات کی گہری سمجھ کے

ذریعے دوسروں کے احوال پہچان لیتا ہے۔ یہ فراست ظاہری اسباب کے دائرے میں رہتے ہوئے عقل، مشاہدہ اور علمِ نفس کے ذریعے پروان چڑھتی ہے، اور معاشرتی تعامل میں یہ نہایت کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ان دونوں معانی میں فرق یہ ہے کہ پہلا محض اللہ کی طرف سے عطا ہونے والا وجدانی علم ہے جو ایک روحانی عطیہ کی حیثیت رکھتا ہے، جب کہ دوسرا انسان کی علمی کاوش، گہرے مشاہدے اور فکری تربیت کا نتیجہ ہے۔ یوں ایک کو "فراستِ موہوبی" اور دوسرے کو "فراستِ کسبی" کہا جا سکتا ہے۔

سیرتِ طیبہ ﷺ میں رسول اللہ ﷺ کے مکاشفات ذکر ملتا ہے، جیسا کہ غزوہ موتہ سے متعلق روایت نقل کی گئی ہے کہ:

عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ، قال: خطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقال: "اخذ الرایۃ زید فاصیب، ثم اخذہا جعفر فاصیب، ثم اخذہا عبد اللہ بن رواحۃ، فاصیب ثم اخذہا خالد بن الولید، عن غیر إمرۃ ففتح علیہ وما یسرنی او، قال: ما یسرہم انہم عندنا، و قال: وإن عینیہ لتذرفان[65]

"انس بن مالک نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے (مدینہ میں) غزوہ موتہ کے موقع پر خطبہ دیا' (جب کہ مسلمان سپاہی موتہ کے میدان میں داد شجاعت دے رہے تھے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب اسلامی علم (جھنڈا) زید بن حارثہ نے سنبھالا اور انہیں شہید کر دیا گیا، پھر جعفر نے علم اپنے ہاتھ میں اٹھالیا اور وہ بھی شہید کر دیئے گئے۔اب عبداللہ بن رواحہ نے علم تھاما' یہ بھی شہید کر دیئے گئے۔آخر خالد بن ولید نے کسی نئی ہدایت کے بغیر اسلامی علم اٹھالیا ہے۔اور ان کے ہاتھ پر فتح حاصل ہو گئی' اور میرے لیے اس میں کوئی خوشی کی بات نہیں تھی یا آپ ﷺ نے فرمایا' کہ ان کے لیے کوئی خوشی کی بات نہیں تھی کہ وہ (شہداء) ہمارے پاس زندہ ہوتے۔ (کیونکہ شہادت کے بعد وہ جنت میں عیش کر رہے ہیں) اور انس نے بیان کیا کہ اس وقت آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔"

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکاشفہ ہی تھا کہ آپ ﷺ بطور معجزہ یہ خبر دے رہے تھے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ مستقبل کے اخبار بھی صحابہ کرام کو دیتے جو آپ ﷺ کو مکاشفہ ہی کی صورت میں حاصل ہوتے۔

(7): مشاہدہ: سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں:

صوفیاء کی اصطلاح میں مشاہدہ کا معنیٰ ہے:

شهود الذات بارتفاع الحجاب مطلقاً[66]

"یعنی حجابات کے مکمل ارتفاع سے ذات کا مشاہدہ کرنا۔"

یہ حقیقت ہے کہ خالق و مخلوق کے مابین بے شمار حجابات موجود ہوتے ہیں جس کی وجہ سے سالک عموماً ذاتِ حق کا مشاہدہ نہیں کر پاتا۔ یہ حجابات مختلف صورتوں کے ہوتے ہیں، جو دیدارِ الٰہی میں مانع ہوتے ہیں لیکن جب سالک روحانی منازل طے کرتا ہے تو وہ ان تمام حجابات کے ختم کرنے پر قادر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان تمام حجابات کو اٹھا دیتے ہیں اور سالک ذاتِ حق کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے جس کو صوفیاء کی اصطلاح مشاہدہ کہا جاتا ہے۔ صوفیاء کرام مشاہدہ کے تین اقسام بیان کرتے ہیں:

(1) منعم کا مشاہدہ (2) نعمت کا مشاہدہ (3) نعمت کی وساطت سے منعم کا مشاہدہ

اول سے مراد ذاتِ باری تعالیٰ کا مشاہدہ ہے جو منعم حقیقی ہے اور انسان پر ہر لمحہ اس کے احسانات کا نزول ہوتا ہے۔ دوسری قسم میں انہی نعمتوں کا مشاہدہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں سالک کے دل و دماغ پر شکر و امتنان کے جذبات حاوی ہوتے ہیں اور وہ مشاہدہ کی حد تک مسلسل اللہ تعالیٰ کے شکر ادا کرتا ہے۔ جبکہ تیسری صورت میں نعمتوں کے مشاہدہ کی صورت میں ذاتِ حق کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ یعنی مسلسل نعمتوں کا فیضان دیکھ کر جب سالک شکر باری تعالیٰ ادا کرتا ہے تو اس کے سامنے سے مادی حجابات ہٹا دیئے جاتے ہیں جس کے بعد وہ ذاتِ حق کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

سیرتِ طیبہ ﷺ میں مشاہدہ کی کیفیات کا ذکر ملتا ہے جیسا کہ بخاری شریف کی روایت ہے کہ :

إِنَّ إِخْوَانَنَا مِنَ الْمُهَاجِرِينَ كَانَ يَشْغَلُهُمْ والصَّفْقُ بِالْأَسْوَاقِ، وَإِنَّ إِخْوَانَنَا مِنَ الْأَنْصَارِ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الْعَمَلُ فِي أَمْوَالِهِمْ،وَإِنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَلْزَمُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشِبَعِ بَطْنِهِ، وَيَحْضُرُ مَا لَا يَحْضُرُونَ، وَيَحْفَظُ مَا لَا يَحْفَظُونَ[67]

" (واقعہ یہ ہے کہ) ہمارے مہاجرین بھائی تو بازار کی خرید و فروخت میں لگے رہتے تھے اور انصار بھائی اپنی جائیداد وں میں مشغول رہتے اور ابوہریرہ، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جی بھر کر رہتا (تاکہ آپ ﷺ کی رفاقت میں شکم پری سے بھی بے فکری رہے) اور (ان مجلسوں میں) حاضر رہتا جن (مجلسوں) میں دوسرے حاضر نہ ہوتے اور وہ (باتیں) محفوظ رکھتا جو دوسرے محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے۔"

يَحْضُرُ مَا لَا يَحْضُرُونَ کا معنیٰ يشاهد و لا يشاهدون ہے جس سے مشاہدہ کی کیفیت کا علم ہوتا ہے۔

صوفیاء کرام مشاہدہ کو معرفت کے لئے شرط قرار دیتے ہیں جس کا تذکرہ سیرتِ طیبہ ﷺ میں موجود ہے :

عن عبد الله بن الديلمي، قال: سمعت عبد الله بن عمرو، يقول: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن الله تعالى خلق خلقه في ظلمة، فألقى عليهم نورا من نوره، فمن أصابه من ذلك النور اهتدى، ومن أخطأه ضل[68]

"عبداللہ بن الدیلمی فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو سے سنا وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا بے شک اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا اندھیرے میں پس ڈالا ان پر نور کو اپنے نور سے پس جس کو پہنچا اس کے نور سے ہدایت پا گیا اور جس کو نہ پہنچا گمراہ ہو گیا۔"

صرف یہی نہیں بلکہ سیرتِ طیبہ ﷺ میں بھی رسول اللہ ﷺ کی کیفیت مشاہدہ کا تذکرہ موجود ہے کہ :

أنه صلى الله عليه وسلم كان مطالبا برؤية مشاهدة الحق مع معاشرة الناس بالنفس والكلام[69]

"بے شک رسول اللہ سلاا ہم مطالبہ کرنا تھا رد یت کا حق کے مشاہدہ کے ساتھ باوجود میل جول نفس اور کلام کے ساتھ لوگوں کے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کے صوفیاء جو مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے لئے کچھ ظاہری طروق اختیار فرماتے ہیں، اس کا اصل تو سیرتِ طیبہ ﷺ ہی ہے، البتہ طروق و ذرائع میں کہی فرق ہو سکتا ہے، اس صورت میں، ہم اس کو غیر شرعی کہنے کے بجائے ان طروق و ذرائع کا جائزہ لیں گے کہ ان کی شرعی حیثیت کیا ہے اور شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

(8): محاضرہ: سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں:

اشغالِ صوفیاء میں آخری اور اہم شغل "محاضرہ" ہے جس کے لفظ سے ہی حضور اور حاضری کا مفہوم متبادر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن صوفیاء نے محاضرہ کی تعریف کی ہے کہ :

"محاضرہ اللہ تعالیٰ کے مبارک و مقدس اسماء کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حضوری قلب کا نام ہے۔"[70]

جبکہ ڈاکٹر رفیق العجم کے مطابق محاضرہ مسلسل دلیل کے ساتھ حضورِ قلب ہے۔[71] یعنی صوفیہ کرام کی اصطلاح میں محاضرہ سے مراد دل کی حاضری یا قلبی موجودگی ہے۔ اس مقام پر روحانی سالک، اگرچہ ظاہری دنیا میں پردے یا فاصلوں کی حالت میں ہو، اپنے باطن میں رب کے قرب و حضور کا شعور حاصل کرتا ہے۔ یہ حضوری بعض اوقات متواتر برہان یا منطقی دلیل کے ذریعہ بھی حاصل ہو سکتی ہے، لیکن اس کا اصل انحصار ذکر و مراقبہ پر ہوتا ہے۔ صاحب محاضرہ کی رہنمائی اس کی عقل و فہم کرتی ہے، جو اسے علامات اور مظاہر کے ذریعہ اللہ کے قرب تک پہنچاتی ہے۔ ہم نے یہ واضح کیا تھا کہ مکاشفہ میں سالک کی روحانی صفات اور خصلتیں اسے اللہ کی حقیقت کے قریب لے آتی ہیں اور مشاہدہ معرفت کا اعلیٰ ترین اور عمیق ترین مقام ہے، جس میں سالک حقیقت کے ساتھ مستقیم تعلق قائم کر لیتا ہے۔ اس کیفیت میں ہر پردہ اور حجاب اٹھ چکا ہوتا ہے اور روحانی انسان کامل طور پر حقائقِ الٰہی میں غرق ہو جاتا ہے۔ جبکہ محاضرہ اس سے مختلف ہے اور اس میں حضور قلب کا ہونا ضروری ہے۔

محاضرہ ان لوگوں کا مقام ہے جو ابھی روحانی رنگ و روش بدل رہے ہیں، یعنی روحانی تجربات کے ابتدائی مراحل میں ہیں اور ان کے اعمال و فکر میں تسلسل و استحکام ابھی مکمل نہیں ہوا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جسے صوفیہ *تلوین* کہتے ہیں، جہاں انسان کی روحانی صفات متنوع اور تغیر پذیر ہوتی ہیں۔ اس مقام پر انسان کی تربیت زیادہ تر مشاہدہ و رہنمائی کے ذریعے ہوتی ہے اور اس کا تعلق *علم الیقین* سے ہے، یعنی ابتدائی یقین اور علم جو ابھی مکمل تجربے کی بنیاد پر ثابت نہیں ہوا۔ مکاشفہ وہ درمیانی مقام ہے جو محاضرہ اور مشاہدہ کے درمیان واقع ہے۔ یہاں انسان روحانی بصیرت حاصل کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حقیقتوں کو تجرباتی طور پر محسوس کرتا ہے، مگر یہ مشاہدہ ابھی مستحکم اور مستقل نہیں۔ مکاشفہ کے مرحلے میں انسان کو عین الیقین حاصل ہوتا ہے، یعنی وہ براہِ راست تجربے اور مشاہدے کے ذریعے حقیقت کو جان لیتا ہے، مگر ابھی یہ اس کی شخصیت میں مکمل استقرار اختیار نہیں کرتا۔ مشاہدہ وہ مقام ہے جہاں روحانی استقامت اور پختگی مکمل ہو چکی ہوتی ہے، جسے صوفیہ *تمکین* کہتے ہیں۔ اس مرحلے پر انسان ہر لمحہ اللہ کی موجودگی اور حقیقتِ الٰہی کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کی معرفت مستقل اور غیر متزلزل ہو جاتی ہے۔ مشاہدہ کے اہلین *حق الیقین* کے مرتبت پر فائز ہوتے ہیں، یعنی وہ اس حقیقت کے علم میں ہیں جو قطعی اور مطلق ہے۔[72]

صوفیاء کرام کے ہاں محاضرہ انسان پر کسی ایسی عارضی و غیر دائمی کیفیت کی صورت میں طاری ہوتا ہے جس کے اثرات انسان بدن کے کسی حصہ پر محسوس کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم صوفیاء کرام سے ایک لفظ سنتے ہیں، وجد۔ یہ بھی ان کے ہاں محاضرہ ہی ہے کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص قسم کی کیفیت ذکر و وظائف کی کثرت کی وجہ سے طاری ہوتی ہے۔ یہ ایک انتہائی عارضی کیفیت ہوتی ہے جو بہت جلد زائل ہو جاتی ہے لیکن عشق اور محبت کی گرمی و اثر برقرار رہتا ہے۔ بعض صوفیاء وجد کو من جانب اللہ مقام مشاہدہ کی طرف ترقی کی بشارت کے طور پر دیکھتے ہیں کہ جس سالک پر وجد طاری ہو تو اس کا معنیٰ و مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مقام مشاہدہ سے سرفراز کرنے کا ارادہ فرمایا ہے جس کی خوشخبری و بشارت کے لئے سالک پر ایسی کیفیت طاری کی گئی ہے۔[73]

بعض اہلِ علم نے وجد کی تعریف کی ہے کہ اللہ تعالی کے کلام پاک سے متاثر ہونے یا اللہ پاک کا ذکر کرنے یا اس پاک ذات کا خوف پیدا ہونے سے جب انسانی بدن کانپ اٹھے یا حرکت کرنے لگے اور بدن کی یہ حرکت خواہ تمام بدن کی ہو یا بدن کے بعض حصوں کی ہو یا تمام چمڑے کے حرکت ہو یا بعض چمڑے کی، اسے وجد سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور یہ حالت غیر اختیاری ہوتی ہے۔[74]

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ :

وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَاۚ-فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ[75]

"اور موسیٰؑ نے ہمارے وعدے کے لیے اپنی قوم سے ستر مرد منتخب کر لیے پھر جب انہیں رجفہ (بدن کی حرکت) نے پکڑ لیا۔"

علامہ آلوسیؒ کے نزدیک رجفہ دراصل انوارِ الٰہی کا اثر تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم میں سے ایسے پاکیزہ اور اہلِ سلوک افراد منتخب کیے جن کے دل روحانی لطافت سے بھرپور تھے۔ جب ان پر یہ کیفیت طاری ہوئی تو یہ دراصل تجلیاتِ الٰہیہ کے اثر سے پیدا ہونے والی ابتدائی روحانی کیفیت (فنا کی ابتدا) تھی، جس میں بدن پر غیر ارادی لرزش اور اضطراب ظاہر ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام کے ہاں یہ کیفیت عموماً ذکر و تلاوت کے دوران ظاہر ہوتی ہے اور کبھی اس کی شدت سے جسم میں غیر اختیاری حرکات یا آوازیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔[76]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ :

إذا اقشعر جلد العبد من خشية الله: تحاتت عنه خطاياه كما تحات عن الشجرة البالية ورقها[77]

"جب بندے کی کھال اللہ کے خوف سے کانپ اٹھتی ہے تو اس کے گناہ اس سے یوں جھڑ جاتے ہیں جیسے سوکھے درخت سے پتے جھڑ جاتے ہیں۔"

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ خشیتِ الٰہی انسان کی باطنی اصلاح کا بنیادی ذریعہ ہے۔ جب بندہ اللہ کی عظمت اور آخرت کی جواب دہی کو شعوری طور پر محسوس کرتا ہے تو اس کے دل میں ایسا خوف پیدا ہوتا ہے جس کے اثرات جسم پر بھی ظاہر ہوتے ہیں، حتیٰ کہ اس کی کھال کانپ اٹھتی ہے۔ یہی خشیت دراصل علمِ الٰہی کا نتیجہ ہے، کیونکہ جتنا معرفت بڑھتی ہے اتنا ہی دل میں وقار آمیز خوف پیدا ہوتا ہے۔ اسی کیفیت کے نتیجے میں گناہ خود بخود ختم ہونے لگتے ہیں۔ حدیث میں اسے اس مثال سے بیان کیا گیا ہے کہ جیسے خشک درخت سے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ یعنی جب دل کا رخ اللہ کی طرف ہو جائے اور نفس کی وابستگی کمزور پڑ جائے تو معاصی بتدریج ختم ہو جاتے ہیں، بغیر کسی ظاہری جبر کے۔ یہی کیفیت اسی قسم کے شغل یعنی محاضرہ میں انسان پر طاری ہوتی ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ ﷺ پر یہی کیفیت طاری ہوئی اور آپ ﷺ کانپتے ہوئے گھر تشریف لائے :

فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجُفُ فُؤَادُهُ[78]

"آپ ﷺ اس حال میں غار حرا سے واپس ہوئے کہ آپ ﷺ کا دل اس انوکھے واقعہ سے کانپ رہا تھا۔"

واضح رہے کہ اس کیفیت کو عموماً وجد کہہ دیا جاتا ہے اور جب یہ کیفیت بندے کے باطن میں شدت اختیار کر لیتی ہے تو اس کا اظہار مختلف جسمانی، نفسیاتی اور لسانی صورتوں میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔ بعض اوقات یہ کیفیت بدن کے لطیف نظام پر اثر انداز ہو کر غیر معمولی حرکات پیدا کرتی ہے، جیسے اعضا میں لرزش، جسم کا کانپ اٹھنا اور اقشعرار، جو دراصل باطن میں وارد ہونے والے انوار کا طبعی اثر ہوتا ہے۔ کبھی وارد کی شدت اور تواجد کی لذت کے باعث رقص، گردش اور تیز حرکات صادر ہونے لگتی ہیں، جو سالک کے اختیار سے باہر ہوتی ہیں۔ اسی طرح بعض مواقع پر منہ سے بے ساختہ مختلف الفاظ یا آوازیں نکلنے لگتی ہیں، جیسے آہ، اوہ، اف، بابا، لا، لا، اللہ اللہ، ہو ہو وغیرہ۔ وجد کی ایک صورت گریہ وزاری بھی ہے، جو کبھی بلند آواز کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے اور کبھی محض آنسوؤں کی روانی تک محدود رہتی ہے۔ پہلی کیفیت کو اہلِ تصوف بکاء مرتفع کہتے ہیں، جبکہ دوسری حالت میں خاموش آنسو دل کے اندرونی

اضطراب کی گواہی دیتے ہیں۔ بعض اوقات انوار کے غلبے سے ایسی ہیبت اور خوف طاری ہو جاتا ہے کہ بندہ چیخ اٹھتا ہے یا کپڑے پھاڑ بیٹھتا ہے، جیسا کہ قرآن کے مضمون تمت تسمعی سے ماخوذ خوف واضطراب کی کیفیت میں ذکر کیا جاتا ہے۔

بعض سالکین پر وجد اس قدر غالب آ جاتا ہے کہ شدید رقص یا حرکت کے نتیجے میں جسمانی نقصان کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ تاریخِ تصوف میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ وجد کی شدت نے بعض افراد کی جان لے لی۔ منقول ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بعض متبعین میں یہ کیفیت اس قدر غالب ہوتی تھی کہ وجد کے عالم میں کثیر تعداد میں افراد وفات پا جاتے تھے۔ اسی طرح کبھی بلا اختیار مجذوبیت کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔[79] یہ غیر اختیاری حرکات، چیخ و پکار اور صیحات کبھی حالتِ نماز میں بھی طاری ہو جاتی ہیں اور کبھی نماز سے باہر، اور بعض اوقات سالک پر غلبۂ حال اس درجہ ہوتا ہے کہ وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ یہ تمام کیفیات دراصل اس امر کی علامت ہیں کہ باطن پر وارد ہونے والے انوار اور تجلیات انسانی طاقت سے بڑھ کر اثر رکھتی ہیں۔ اہلِ سلوک اور صوفیہ کرام نے وجد اور محاضرہ کی مختلف اقسام بیان کی ہیں جو ایک مستقل موضوعِ تحقیق ہے لیکن یہاں یہ سمجھنا اہم ہے کہ وجد یا اسی طرح دیگر کیفیات محاضرہ ہی کی وجہ سے انسان پر طاری ہوتے ہیں جیسا کہ ہم سیرتِ طیبہ ﷺ سے مثال پیش کر چکے۔

خلاصہ کلام:

یہ تحقیق اس بنیادی حقیقت کو مدلل انداز میں سامنے لاتا ہے کہ تصوف میں رائج تمام اشغال و مقامات کی اصل و روح سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ سے ماخوذ ہے، اور صوفیہ کرام نے جن عملی مناہج کو ترتیب دیا ہے وہ کسی نئے یا مستقل نظام کی ایجاد نہیں بلکہ اسوۂ نبوی ﷺ کے باطنی و اخلاقی پہلو کی منظم توضیح ہیں۔ اسی تناظر میں سہولتِ فہم کے لیے مجاہدہ، محاسبہ، مشارطہ، مراقبہ، مقابلہ، مکاشفہ، محاضرہ اور مشاہدہ جیسے اہم اشغال کو موضوعِ بحث بنایا گیا، تاکہ سالک کے روحانی سفر کی تدریجی ساخت اور اس کے فکری و عملی مراحل واضح ہو سکیں۔

تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ مجاہدہ کے ذریعے نفس کی سرکشی کو ضبط میں لایا جاتا ہے اور محاسبہ کے ذریعے بندہ اپنے اعمال و احوال کا مسلسل جائزہ لے کر اصلاح کی راہ اختیار کرتا ہے، جبکہ مشارطہ انسان کے اندر ذمہ داری اور التزامِ شرعی کا شعور بیدار کرتا ہے۔ اس کے بعد مراقبہ سالک کو ہمہ وقت اللہ کی حضوری کا احساس عطا کرتا ہے، جو ایمان کو محض نظری عقیدہ نہیں بلکہ زندہ شعور بنا دیتا ہے۔ مقابلہ کے مرحلے میں باطن کے متضاد رجحانات میں توازن پیدا ہوتا ہے اور نفس، عقل اور قلب کے درمیان ہم آہنگی قائم ہوتی ہے۔

آگے چل کر مکاشفہ اور محاضرہ کے مقامات میں دل پر انوار و معانی کے انکشاف کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جو سالک کے یقین کو مضبوط تر کرتا ہے، یہاں تک کہ مشاہدہ کے مقام پر اسے حقیقتِ توحید کا وجدانی ذوق نصیب ہوتا ہے۔ یوں یہ تمام اشغال ایک مربوط اور ہم آہنگ روحانی نظام تشکیل دیتے ہیں جو انسان کو ظاہری اعمال کی درستگی سے لے کر باطنی صفائی، اخلاقی استقامت اور قربِ الٰہی تک پہنچاتا ہے۔ بالآخر مقالہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ تصوف کا یہ پورا منہج دراصل سیرتِ نبوی ﷺ کا عملی و روحانی تسلسل ہے، جو ہر دور میں تزکیۂ نفس اور تعمیرِ انسانیت کا مؤثر ذریعہ رہا ہے۔

تجاویز و سفارشات:

1. تصوف کے تمام اشغال کو سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ واضح طور پر مربوط کر کے پیش کیا جائے، تاکہ یہ شبہ باقی نہ رہے کہ یہ اعمال شریعت سے الگ یا ماورا کوئی مستقل نظام ہیں، بلکہ انہیں اسوۂ نبوی ﷺ کی باطنی توسیع کے طور پر سمجھا جائے۔
2. مجاہدہ، محاسبہ اور مشارطہ جیسے ابتدائی اشغال کو دینی تعلیم و تربیت کا لازمی حصہ بنایا جائے، خصوصاً مدارس اور خانقاہی نظام میں، تاکہ اصلاحِ نفس کا آغاز مضبوط بنیادوں پر ہو اور انتہاپسندی یا غلو سے بچاؤ ممکن ہو۔
3. مراقبہ، محاضرہ اور مشاہدہ جیسے اعلیٰ مقامات کی تعلیم عام افراد کو تدریج اور اہلیت کے بغیر نہ دی جائے، بلکہ انہیں مستند اور صاحبِ علم مشائخ کی نگرانی میں رکھا جائے تاکہ روحانی انحراف یا نفسیاتی پیچیدگیوں سے تحفظ رہے۔
4. عصرِ حاضر کے فکری و نفسیاتی مسائل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تصوف کے ان اشغال کی تعبیر میں اعتدال، توازن اور مقصدیت کو نمایاں کیا جائے، تاکہ یہ اعمال عملی اخلاق اور سماجی اصلاح کا ذریعہ بنیں۔
5. وجد، مکاشفہ اور دیگر باطنی کیفیات کو مقصود بالذات نہ سمجھا جائے، بلکہ انہیں تزکیۂ نفس اور اطاعتِ الٰہی کے ضمنی ثمرات کے طور پر بیان کیا جائے، تاکہ سالک کی توجہ اصل مقصد یعنی قربِ الٰہی اور حسنِ عمل پر مرکوز رہے۔
6. تصوف پر ہونے والی علمی و تحقیقی کاوشوں میں کلاسیکی صوفی متون کے ساتھ ساتھ سیرت، حدیث اور فقہ کے مآخذ کو بھی شامل کیا جائے، تاکہ ایک جامع اور متوازن اسلامی فکر سامنے آ سکے۔
7. جدید تعلیمی اداروں میں تصوف کو اخلاقی تشکیل اور روحانی تربیت کے مؤثر نظام کے طور پر متعارف کرانے کی کوشش کی جائے۔

ان سفارشات پر عمل کے ذریعے تصوف کے اشغال کو ان کی اصل روح کے مطابق محفوظ رکھا جا سکتا ہے اور انہیں عصرِ حاضر کی فکری و عملی ضرورتوں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے زیادہ بامقصد اور مؤثر بھی بنایا جا سکتا ہے۔

---

[1] سورۃ الاحزاب: 33:21

[2] عیسیٰ، عبدالقادر، حقائق عن التصوف، ط: دارالعرفان، ص 20

[3] ایضاً

[4] العجم، ڈاکٹر رفیق، موسوعۃ مصطلحات تصوف اسلامی، مکتبہ لبنان، 1999، ص 180

[5] علامہ احسان الٰہی ظہیر، تصوف: تاریخ و حقائق، ط: ادارہ ترجمان السنۃ لاہور 2010، ص 38

[6] علامہ احسان الٰہی ظہیر، تصوف: تاریخ و حقائق، ط: ادارہ ترجمان السنۃ لاہور 2010، ص 51

[7] محمد عمیم الاحسان المجددی، التعریفات الفقہیۃ، ط: دار الکتب العلمیہ 2003، ص 57

[8] المعجم الوسیط، ج 1 ص 529

[9] علامہ احسان الٰہی ظہیر، تصوف: تاریخ و حقائق، ط: ادارہ ترجمان السنۃ لاہور 2010، ص 52

[10] ابوالفضل، مولانا عبدالحفیظ، المنجد، ص 437

[11] سورۃ یٰس: 36:55

[12] مفتی، محمد شفیع، معارف القرآن، ط: ادارۃ المعارف کراچی 2004، ج7ص 403

[13] سورۃ یوسف: 12:01

[14] سورۃ القیامۃ: 75:02

[15] سورۃ الفجر: 89:27

[16] اصفہانی، حسین بن محمد، امام راغب، المفردات فی غرائب القرآن، ط: دار القلم 1412ھ، ص 208

[17] سورۃ العنکبوت: 29:06

[18] مجذوب، خواجہ عزیز الحسن، اشرف السوانح حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، ج2، ص 118

[19] البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، كتاب الرقاق، باب كيف كان عيش النبى صلى الله عليه وسلم وأصحابه، وتخليهم من الدنيا، رقم الحدیث: 6457

[20] القشیری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب ما جاء ان الدنيا سجن المؤمن وجنة الكافر، رقم الحدیث: 2972

[21] البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، كتاب الرقاق، باب كيف كان عيش النبى صلى الله عليه وسلم وأصحابه، وتخليهم من الدنيا، رقم الحدیث: 6452

[22] سورۃ المزمل: 73:02

[23] غزالی، محمد بن محمد، احیاء العلوم الدین، ص 940 (اردو ترجمہ، مصباح السالکین از محمد صدیق ہزاروی، ج3، ص 133)

[24] البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، كتاب تفسير القرآن، باب: {ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تأخر ويتم نعمته عليك ويهديك صراطا مستقيما}، رقم الحدیث: 4836

[25] قزوینی، محمد بن یزید بن ماجہ، سنن ابن ماجہ، كتاب إقامة الصلاة والسنة، باب: ما جاء في طول القيام في الصلاة، رقم الحدیث: 1418

[26] قشیری، ابو القاسم عبد الکریم بن ہوزان، رسالہ قشریہ فی علم التصوف، ص 101

[27] البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، كتاب الرقاق، باب: حفظ اللسان، رقم الحدیث: 6474

[28] البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، كتاب الرقاق، باب: حفظ اللسان، رقم الحدیث: 6475

[29] غزالی، محمد بن محمد، احیاء العلوم الدین، ص 989 (اردو ترجمہ، مصباح السالکین از محمد صدیق ہزاروی، ج3، ص 174)

[30] البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، كتاب بَدْءِ الْوَحْيِ، باب: ، رقم الحدیث: 03

[31] ابن عساکر، ابو القاسم، علی بن حسن، معجم الشیوخ، ط: دار الشائر 2000ء، ج2 ص 703

[32] محاسبی، ابو عبد اللہ حارث بن اسد، الرعایۃ لحقوق اللہ، ظ: دار العلمیہ بیروت، ص 45

[33] ابن شیبہ، عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ، مصنف ابن ابی شیبہ كتاب الزهد، رقم الحدیث 5047 (23)

[34] ندوی، محمد زید مظاہری، تربیت السالک، (افادات اشرف علی تھانویؒ) ص 11

35 القشیری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم،کتاب الإمارة، باب قوله صلى الله عليه وسلم: «إنما الاعمال بالنية». وانه يدخل فيه الغزو وغيره من الاعمال:،رقم الحدیث:1907

36 المتقی، علاء الدین، علی بن حسام الدین، کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، ج9، ص11

37 قزوینی، محمد بن یزید بن ماجہ، سنن ابن ماجہ، کتاب الزهد، باب: ذكر الموت والاستعداد له،رقم الحدیث:4260

38 ترمذی، ابوعیسیٰ، ابوعیسیٰ محمد بن سورہ، جامع ترمذی، كتاب الدعوات عن رسول الله صلى الله عليه وسلم،باب منه،رقم الحدیث:3483

39 شہاب الدین، ابوعبداللہ محمد بن سلامہ، مسند شہاب، اللَّهُمَّ آتِ نَفْسِي تَقْوَاهَا، وَزَكِّهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكَّاهَا،رقم الحدیث:1481

40 البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، كتاب الأدب، باب الحذر من الغضب:،رقم الحدیث:6114

41 قزوینی، محمد بن یزید بن ماجہ، سنن ابن ماجہ، کتاب الزهد، باب: ذكر الموت والاستعداد له،رقم الحدیث:4260

42 غزالی، محمد بن محمد، کیمیائے سعادت، ط: انتشارات علمی و فرہنگی، تہران 1380ھ، ج2، ص493

43 ڈاکٹر ولی الدین میر، خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک، ص88

44 ابوالحسن، زید فاروقی، مدارج الخیر و مناہج السیر، ط: دوم 2013ء، ص156

45 العجم، ڈاکٹر رفیق، موسوعہ مصطلحات تصوف اسلامی، مکتبہ لبنان، 1999، ص868

46 نقشبندی، پیر ذوالفقار احمد، تصوف و سلوک، ط: مکتبۃ الفقیر فیصل آباد، ص19

47 حواس باطنہ: (1) قوتِ متخیلہ (2) قوتِ متصورہ (3) قوتِ متفکرہ (4) قوتِ واہمہ (5) قوتِ توجہ

48 القشیری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم،کتاب الإيمان، باب الإيمان ما هو وبيان خصاله:،رقم الحدیث:09

49 نووی، یحیی بن اشرف، ابوزکریا محی الدین، المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج، ط: دارالاحیاء التراث العربی، بیروت 1392، ج1، ص158

50 القشیری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم،کتاب الإيمان، باب الإيمان ما هو وبيان خصاله:،رقم الحدیث:10

51 ترمذی، ابوعیسیٰ، ابوعیسیٰ محمد بن سورہ، شمائل ترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي جِلْسَةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،رقم الحدیث:126

52 ترمذی، ابوعیسیٰ، ابوعیسیٰ محمد بن سورہ، شمائل ترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي جِلْسَةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،رقم الحدیث:128

53 غزالی، محمد بن محمد، منہاج العابدین، ص140 (اردو ترجمہ، از محمد سعید احمد نقشبندی، ص79)

54 سورۃ الاعراف: 07:201

55 ترمذی، ابوعیسیٰ، ابوعیسیٰ محمد بن سورہ، جامع ترمذی، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله صلى الله عليه وسلم،باب ومن سورة البقرة،رقم الحدیث:2988

56 تبریزی ،ولی الدین، ابوعبداللہ، محمد بن عبداللہ، مشکوٰۃ المصابیح، كتاب الجنائز،باب رقية رسول الله صلى الله عليه وسلم لحسين وكريميهما رضي الله عنهما،رقم الحدیث:1535

57 حنبل، امام احمد بن محمد، مسند احمد، مسند المكثرين من الصحابة، مسند ابي سعيد الخدري رضي الله تعالى عنه،رقم الحدیث:11473

58 کاشانی، امام عبدالرزاق، اصطلاحات تصوف، ص346

59 سہروردی، ابو حفص شہاب الدین عمر، عوارف المعارف جزء ثانی، ص47

60 قادری، ابوالحسنات، سید محمد احمد، کلام المرغوب (ترجمہ کشف المحجوب)، ص134

61 البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب المبشرات:، رقم الحدیث:6990

62 البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی، باب:، رقم الحدیث:03

63 ترمذی، ابو عیسیٰ، ابو عیسیٰ محمد بن سورہ، جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ومن سورة الحجر، رقم الحدیث:3127

64 سیوطی، جلال الدین، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، قوت المتغذی علی جامع الترمذی، ج2، ص775

65 البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسير، باب من تأمر فی الحرب من غیر إمرة إذا خاف العدو:، رقم الحدیث:3063

66 کاشانی، امام عبدالرزاق، اصطلاحات تصوف، ص347

67 البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم:، رقم الحدیث:118

68 الشیبانی، ابو بکر بن ابی عاصم، ابن مخلد السنۃ لابی ابی عاصم) (تحقیق: محمد ناصر الدین الالبانی)، ج 1 ص 107، المکتب الاسلامی، بیروت، ط اولی 1400ھ۔

69 المقریزی، احمد بن علی بن عبد القادر، امتاع الأسماع بما للذي من الاحوال والأموال والحفدة والمتاع ج 13 ص 62 دار الکتب العلمیۃ بیروت، ط اول، 1420ھ۔، 1999ء عبدالحمید

70 کاشانی، امام عبدالرزاق، اصطلاحات تصوف، ص100

71 العجم، ڈاکٹر رفیق، موسوعۃ مصطلحات تصوف اسلامی، مکتبہ لبنان، 1999، ص836

72 سہروردی، ابو حفص شہاب الدین عمر، عوارف المعارف جزء ثانی، ص123

73 دہلوی، عبدالحق محدث، تعارف فقہ وتصوف، ص173

74 حنفی، مشتاق احمد، پروفیسر، اقسامِ وجد، ص3

75 سورہ اعراف:07:155

76 آلوسی، محمود بن عبداللہ، شہاب الدین، تفسیر روح المعانی، ج5 ص69

77 الہیثمی، نور الدین علی بن ابی بکر، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، باب فیمن اقشعر من خشية الله، رقم الحدیث: 18217

78 البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب بَدْءِ الْوَحْيِ، باب كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:، رقم الحدیث:3

79 حنفی، مشتاق احمد، پروفیسر، اقسامِ وجد، ص10،9